بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

رشید امجد

مقبول اکیڈمی
۱۰۔ دیال سنگھ مینشن شاہراہ قائد اعظم، لاہور ۳

سرورق ـــــــــــ صادقین

تصویر کا عطیہ ـــــــــــ ڈاکٹر ایوب میرزا

اندر کی تصویریں ــــ پکاسو ـ جارجیو ڈی شیراکو ـ فرانز مارک ـ البرٹ گلینرز ـ
آگسٹ مائیک ـ پال کیبلی ـ ولی بامیسٹر ـ جان گریس ـ
حمید ساغر ــ

بار اول ـــــــــــ ۱۹۸۸ء

اہتمام ـــــــــــ ملک مقبول احمد

مطبع ـــــــــــ ایم ۔ ایس پرنٹرز لاہور

مقبول اکیڈمی، لاہور

SBN 969 442 262 0

شوروم : ۱۰، دیال سنگھ مینشن، شاہراہ قائد اعظم، لاہور ۳
سیلز آفس: ۱۹۰ اسرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲

والد مرحوم غلام محی الدین مونس نقشی

اور

والدہ مرحومہ خورشید بیگم

کے نام

اور جس نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے اس کو حقیقتاً پہچان لیا ہے ، اُس نے اپنے وجود کو معروف کے وجود سے بھی زیادہ عظیم اور بزرگ تر کر لیا ، کیونکہ جو شخص کسی چیز کو اسکی حقیقت کی تہہ تک پہنچ کر پہچان لیتا ہے وہ دراصل اس چیز سے بھی زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔

طواسین
حسین بن منصور حلاج

ہر قدم دورئ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

غالبؔ

ترتیب

دشتِ امکاں

خزانے والا خواب برسوں پرانا تھا،
ایک صبح ناشتہ کرتے ہوئے ماں نے کہا تھا ـــــ "مجھے یقین ہے کہ
اس گھر میں کہیں خزانہ ہے۔"
ان کی خاموشی پر وہ جھجک سی گئی ـــــ "رات میں نے پھر وہی
خواب دیکھا ہے۔"
اس نے پوچھا ـــــ "کون سا خواب؟"
"وہی خزانے والا ـــــ میں وہاں تک پہنچ بھی گئی تھی"
اس نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ "تو پھر نکال کیوں نہ لائیں؟"
"بس" ماں نے جھرجھری لی ـــــ "میں وہاں تک پہنچ تو گئی، لیکن ـــــ"
"لیکن کیا؟" چھوٹی بہن نے جلدی سے پوچھا
"جب میں نے ہاتھ بڑھا کر اٹھانا چاہا تو ـــــ" ماں نے پھر جھرجھری
لی، ایک لمحہ کے لئے جیسے خواب اُس کی آنکھوں میں مجسم ہوگیا ـــــ "کسی
نے میری کلائی پکڑ لی۔"

وہ ہنس پڑا ــــــــ "خزانے کے سانپ کی بات تو سنی ہے لیکن سانپ نے کلائی کب سے پکڑنی شروع کردی ہے"

ماں نے بُرا سا منہ بنایا اور بولی ــــــــ "تم تو بس مذاق ہی اڑانے کے لئے ہو، لیکن میں سچ کہتی ہوں اس گھر میں کہیں خزانہ ضرور ہے، ایک دن تم ــــــــ یاد رکھنا بس"۔

اس نے کندھے جھٹکے ــــــــ "جلدی سے چائے بنا دیں، دفتر دیر ہو رہی ہے"

بس میں سوار ہوتے ہوئے اسے ایک لمحہ کے لئے ماں کی بات یاد آئی اور خزانے کی نرم نرم گرمی اس کے جسم میں لہراتے لمس کی طرح رقص کرنے لگی، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی نظریں اگلی سیٹوں سے جا چپکیں، وہ ابھی ابھی سوار ہوئی تھی اور کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی نظروں ہی نظروں میں سٹاپ آگیا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے سرگوشی کی ــــــــ "واپسی پر چائے کا کپ چلے گا نا"

وہ مسکراتی اور اٹھلاتی ہوئی آگے نکل گئی۔

چائے پیتے ہوئے وہ چپ چپ رہی۔

اُس نے پوچھا ــــــــ "کیا بات ہے آج ہیڈ مسٹریس سے ڈانٹ تو نہیں پڑی"۔

"نہیں تو"

"پھر"

"بس اب تم ماں جی کو ہمارے گھر بھیج ہی دو"

وہ چپ ہو گیا، بہت دیر چپ رہا، پھر بولا ــــــــ "بھیج دینے میں

تو حرج نہیں، اور ماں آنا بھی چاہتی ہے، لیکن ——"

"لیکن کیا؟"

"سوچتا ہوں کچھ ہاتھ کھل جاتا تو اچھا تھا"

ایک لمحہ کے لئے اسے خزانے کا خیال آیا، کیا معلوم واقعی گھر میں کہیں خزانہ ہو —— اگر ہاتھ آجائے تو —— ایک گرم لہر نے اس کے اندر انگڑائی لی،

"کیا بات ہے؟" وہ ہنسی —— "اندر ہی اندر مسک رہے ہو"

"بس ایسے ہی" اس نے سر ہلایا —— "خواب بھی عجیب چیز ہیں"

"سوچتا ہوں اگر خواب نہ ہوتے تو ہم جیسوں کا کیا بنتا"

وہ ہنسی —— "اسی تنخواہ پر گزارہ کرتے"

چند لمحے خاموشی رہی، پھر بولی —— "تو کب آرہی ہیں ماں جی؟"

"جب کہو" اس نے شانے اچکائے —— "لیکن بہنوں کی شادی ہو جاتی تو اچھا تھا، باپ تو میرا ہے نہیں، آخر یہ سب کرنا تو مجھے ہی ہے"

"تو مل کر کریں گے" اس نے اس کا ہاتھ دبایا —— "اب تم اکیلے ہو، پھر میں تمہارے ساتھ ہوؤں گی"

وہ کچھ نہیں بولا —— بس خیال سا آیا کہ کیا معلوم گھر میں کہیں خزانہ ہو ہی؟

رات کو کھانا کھاتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ ماں خزانے والی بات پھر چھیڑے، لیکن ماں کو اس رات گیس اور بجلی کے بلوں کی فکر تھی کہ اگلے دن ان کی آخری تاریخ تھی۔

پھر کئی ماہ گزر گئے۔ خزانے اور خواب آتے گئے ہو گئے۔ اس دوران
ماں اُس کی شادی کی بات پکی کر آئی۔
ایک صبح ناشتہ کرتے ہوئے ماں نے پھر خزانے کا ذکر چھیڑا اور بولی ــــــ "رات
میں نے پھر وہی خواب دیکھا ہے ــــــ لیکن بس" لمحہ بھر چپ رہنے کے بعد
بولی ــــــ "بس کوئی میری کلائی پکڑ لیتا ہے ٹھنڈے برف ہاتھ والا"
بہن نے پوچھا ــــــ "آپ نے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ کون ہے؟"
ماں نے خوف سے جھرجھری لی ــــــ "ایک ٹھنڈا برف ہاتھ، میرا تو سارا جسم
کانپنے لگتا ہے، اور پھر آنکھ کھل جاتی ہے"
وہ بولا تو کچھ نہیں لیکن سوچا ــــــ کیا معلوم واقعی یہاں خزانہ ہو، اور یہ کوئی
غیبی بشارت ہی ہو؟
اگلے دن ماں اور بہنوں نے اس کے سسرال تاریخ مقرر کرنے جانا تھا۔
وہ گھر میں اکیلا رہ گیا، کچھ دیر پڑھتا رہا، پھر جانے کیسے خزانے کا خواب
آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس کے اندر داخل ہوا اور لمحوں میں سارے وجود
پر پھیل گیا۔
اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور سوچنے لگا کہ اگر خزانہ ہے تو کہاں
ہو سکتا ہے؟
برسوں سے خزانے کا ذکر سنتے سنتے ایک دو جگہیں اس کے ذہن میں کلبلاتی
رہتی تھیں، لیکن دوسروں کی ہنسی اور اس خوف سے کہ کہیں اس کے تجسس کا مذاق
نہ اڑایا جائے اُسے کبھی انہیں دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اب گھر خالی دیکھ کر اس
نے پرانے تھیلے سے چھینی اور ہتھوڑا نکالا اور بڑے دلان کی الماری کے آخری خانے
کی طرف چل پڑا۔ یہ خانہ اسے ہمیشہ اندر سے کھوکھلا محسوس ہوا تھا۔ کیا معلوم اس کے

نیچے کوئی خفیہ خانہ ہو اور اس میں ——— تختہ نکالتے نکالتے اس کا ہاتھ زخمی ہو
گیا، لیکن خزانے کے گرم گرم مس نے درد کا احساس ابھرنے نہ دیا۔ خانے
کے نیچے کچھ بھی نہیں تھا

لیکن وہ مایوس نہیں ہوا

سونے کے کمرے کے فرش کا ایک ٹکڑا بھی اسے مشکوک لگتا تھا۔ تختے کو
اپنی جگہ جما کر اُس نے سونے والے کمرے کی غربی دیوار کے ساتھ کی ان دو اینٹوں
کو نکالا جو ذرا مختلف انداز سے لگی ہوئی تھیں۔ لیکن وہاں سے بھی کچھ نہ نکلا۔ ایک
دو جگہیں اور بھی تھیں لیکن گھر والوں کی واپسی کا وقت ہوا جا رہا تھا۔

اگلے چند دن شادی کی تیاریوں اور ہنگاموں میں گزر گئے۔ بیوی کے آنے
سے گھر میں کچھ آسانیاں ہو گئیں۔ اس کی تنخواہ نے کئی رکی ہوئی ضرورتوں کو پہیے
لگا دئے۔ جہیز کی چیزوں نے خالی گھر کو بہت حد تک بھر دیا۔

اگلے دو سالوں میں بہنیں بھی بیاہ کر اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔

اس دوران، ماں کبھی خواب کا ذکر کرتی تو چند دنوں کے لئے خزانے
کا تصور اسے ایک نئی گرماہٹ سے آشنا رکھتا۔ وہ موقعہ دیکھ کر مختلف جگہوں
کی کھدائی کرتا رہتا۔ مایوس ہوتا، چند دن بعد کسی دوسری جگہ کا انتخاب کرتا ———
——— کچھ دن خزانے کا خواب اسے اپنی نرم گرم بُکل میں دبائے رکھتا، پھر آہستہ
آہستہ زندگی کی روا روی کی ٹھنڈک اس پر غالب آجاتی۔

ماں بھی اب خزانے کا ذکر سب کے سامنے نہ کرتی شائد اسے بہو کے سامنے
اپنے خواب کا ذکر کرتے جھجک آتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی جب بہو باورچی خانے میں
ہوتی تو اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کرتی ——— خزانہ کہیں ہے ضرور"

وہ سنجیدگی سے پوچھتا ——— "لیکن کہاں؟"

اور کبھی مذاق سے کہتا ——— "تو کیا سارے گھر کو کھود ڈالوں، ایک گھر ہی تو ہے ہمارے پاس"

ماں چپ ہو جاتی اور خزانے کے ذکر پر کئی کئی مہینوں کی دھول پڑ جاتی، لیکن مرنے سے چند روز پہلے وہ تواتر سے خزانے کا ذکر کرنے لگی۔ ناشتہ کی میز پر جو بھی کچھ لینے ادھر ادھر ہوتی وہ سرگوشی میں کہتی ——— "پھر وہی خواب ——— ضرور یہ کوئی غیبی بشارت ہے"

بظاہر وہ اس کی بات پر توجہ نہ دیتا لیکن اندر ہی اندر اسے یقین سا ہونے لگا تھا کہ خزانہ کہیں ہے ضرور۔ سب کی نظریں بچا کر وہ ان جگہوں کو بار بار دیکھتا جن کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ وہاں خزانہ ہو سکتا ہے۔

ماں کے مرنے کے بعد بھی خزانے کا تصور اس کے ذہن سے پوری طرح محو نہ ہوا۔ مرنے سے ایک دن پہلے اس نے پھر کہا تھا ——— "میرا خواب جھوٹا نہیں ہو سکتا، یہ تو غیبی اشارہ ہے"۔

جب کبھی گھر خالی ہوتا تو وہ پرانے تھیلے سے اپنے اوزار نکال کر مختلف جگہیں ٹٹولتا۔ واپسی پر اس کی بیوی کسی اکھڑی ہوئی اینٹ یا الماری کا ٹوٹا خانہ دیکھ کر استفسار کرتی تو وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے ٹال دیتا کچھ دن کے لئے خزانے کا تصور دھندلا جاتا،

پھر کسی صبح ماں یاد آ جاتی تو خزانہ بھی چمکنے لگتا اور جب بیوی بچوں کو لے کر کسی دن میکے جاتی تو وہ اپنے اوزاروں کے تھیلے کو نکال لیتا ——— ہاتھ زخمی ہوتے، دیواروں کا اکھڑا پلستر گھر کی خستگی میں اور اضافہ کر دیتا۔

پھر متعدد الماریوں، دیواروں اور فرش کے حصوں کو اکھیڑ اکھیڑ کر وہ خزانے سے مایوس ہو گیا اور رفتہ رفتہ کئی سالوں میں خزانے کا خواب، اسی کی گرماہٹ

اور چمک اس کی زندگی سے نکل گئی۔

لیکن اب برسوں بعد ناشتہ کرتے ہوئے جب اُس کے بیٹے نے یہ کہا کہ "ابو میرا خیال ہے اس گھر میں کہیں خزانہ ہے" تو وہ چونک پڑا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

بیٹا ایک لمحے چُپ رہا پھر بولا ـــــــ "ابو میں نے رات خواب دیکھا ہے"

جواباً وہ کچھ نہیں بولا ـــــــ اسے یاد آیا کہ اگلے ماہ وہ دونوں میاں بیوی ریٹائر ہو جائیں گے تو گھر کا سارا بوجھ بیٹے پر آن پڑے گا۔ اُس نے اپنے کندھے پر اُس ٹھنڈے برف ہاتھ کی ٹھنڈک کو محسوس کیا۔ ایک انجانا خوف اس کے سارے وجود پر چھا گیا۔ بڑی حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا ـــــــ "شائد وراثت میں خواب بھی منتقل ہو جاتے ہیں۔"
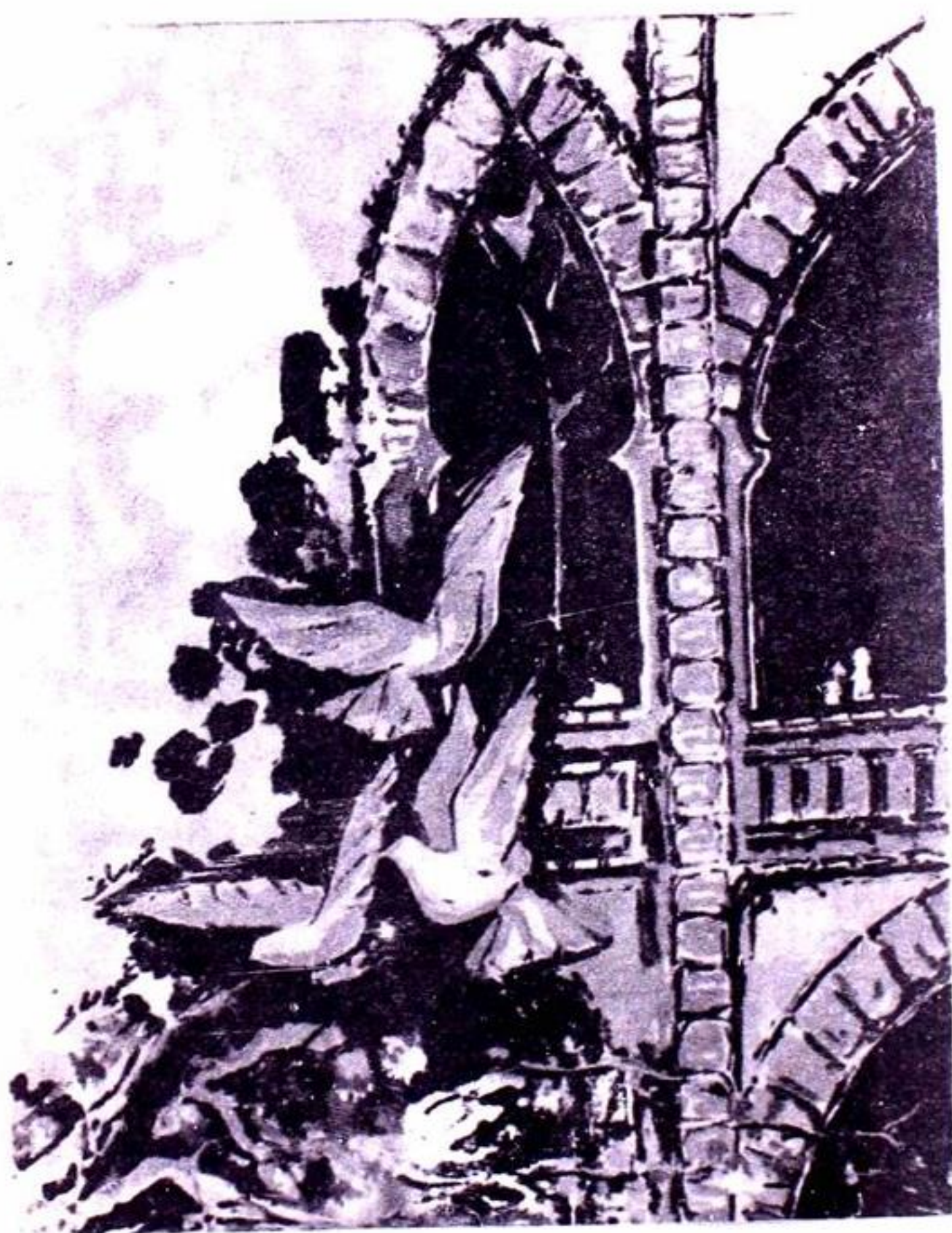
لمحہ جو صدیاں ہوا

یہ مزار بڑی سڑک سے مڑتے ہی تالاب کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر ہے۔ اس کی ٹوٹی منڈیر سے میں نے کتنے ہی موسموں کے پرندوں کو تالاب کے کنارے دھندلاتے اور روشن ہوتے دیکھا ہے، کبھی کبھی جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو چیزیں دھندلی دھندلی سی دکھائی دیتی ہیں۔ دور خاک کے بادلوں کو چیرتا ایک خرقہ پوش شہر کے دروازے پر دستک دیتا ہے،

میری خاک اب اس شہر کی مٹی میں پیوست ہو گی،
صدیوں کی دھول قبروں کے نشان مٹاتی چلی جاتی ہے،
اپنی ہی قبر پہ پاؤں رکھتا ایک نوجوان تیزی سے گزر جاتا ہے،
میرا خمیر اسی شہر کی مٹی سے اٹھا ہے
شہر کی فصیل سے آخری تیر چلاتے ہوئے اس کا زخمی جسم آدھا لٹک جاتا ہے۔
موسم بھیس بدل کر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں، دن اور لمحے اُڑ اُڑ کر وقت کی جھولی میں گرتے چلے جاتے ہیں ـــــــ خزاں بہار، بہار اور خزاں ـــــــ خوابوں کے پیچھے بھاگتا ایک اور نوجوان چائے خانے کی میز پر مکہ

مارتے ہوئے کہتا ہے ——— خواب حقیقتیں ہیں۔

میں ان سارے چہروں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں،
شہر کے دروازے پر دستک دیتا خرقہ پوش، فصیل پر کھڑا تیر انداز اور چائے خانے کی میز پر مکہ مارتا نوجوان ——— میں ان سے بہت فاصلے پر ہوں،
دور سے خرقہ پوش کی آواز آتی ہے
یہ سب ایک دائرہ ہے
دائرہ در دائرہ ——— جس کی ایک سطح پر تو پہنچا جا سکتا ہے، لیکن دوسری سطح پر انقطاع ہو جاتا ہے اور تیسری حقیقۃ الحقیقۃ کے بیابانوں کی سطح ہے جہاں سرگشتگی اور تحیر کے سوا کچھ نہیں ———!
پھر ایک نعرہ مستانہ سنائی دیتا ہے ———. جو راز ہے وہ راز ہے جو وارد ہو اسے بخوشی برداشت کرے،
میں پوچھتا ہوں ——— "یہ راز مجھ پر کب منکشف ہو گا؟"
خرقہ پوش دھند میں ڈوبتے ڈوبتے لمحہ بھر کے لئے سامنے آتا ہے ———
——— "راز اس وقت منکشف ہوتا ہے جب واصف، موصوف اور وصف میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا"
دھند آہستہ آہستہ گہری ہوتی چلی جاتی ہے،
شہر کی فصیل پر کھڑا تیر انداز، تیر نکالتا ہے، اسے چلہ میں جوڑتا ہے
"میری خاک اس شہر کی مٹی میں دفن ہے اور میں نے خرقہ اتار کر تیر کمان سنبھال لیا ہے کہ سچ کی کوئی زبان، کوئی بھیس لباس نہیں ہوتا"
یہ شہر، خرقہ پوش، یہ سپاہی میرے وجود کے ملبے میں دور کہیں دبے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے ان کی دھیمی دھیمی آوازیں اور دھندلی شبیہیں دکھائی دیتی

ہیں لیکن مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں اپنے وجود کی اس گہری کھائی کو عبور کر کے ان تک پہنچوں ۔ میں تو صرف اس نوجوان تک ہی پہنچ پاتا ہوں جو دوستوں کے ساتھ فٹ پاتھ کے کنارے کسی چائے خانہ میں کبھی دوسروں سے اور کبھی اپنے آپ سے مکالمہ کر رہا ہے ،

وہ بھری بھری راتیں اور پھیکے پھیکے دن ــــــــ دن کا وہی ایک معمول، صبح بغیر منہ دھوئے ، بغیر شیو کئے آنکھیں ملتے دفتر کی طرف بھاگنا اور دن بھر فائلوں کی بنجر گود میں زندگی کا شگوفہ تلاش کرنا ، لیکن راتیں بڑی زرخیز تھیں ، شام ہوتے ہی کسی ویران سے چائے خانے میں اکٹھے ہونا ، دیر تک سمجھ نہ آنے والی باتیں کرنا ــــــــ اپنے آپ کو ، دوسروں کو جاننے دریافت کرنے کی باتیں ، پھر دیر تک شب گردی ، گھر کی طرف تنہا آتے ہوئے ویران سڑکوں ، درختوں اور کھمبوں سے مکالمہ ــــــــ ایک عجیب مزہ تھا ، لیکن اب تو ایک خاموشی ہے ، پر اسرار خاموشی ، نہ صبح دفتر جاتے ہوئے کوئی انہونی بات نہ راتوں کی گود میں کوئی ہمکتا شگوفہ ــــــــ معمول اب بھی ہے صبح وقت پر اٹھنا ، شیو کرنا ، تیار ہو کر دفتر جانا اور دن بھر فائلوں پر لوگوں کے مقدر کی لکیریں کھینچنا ــــــــ اور راتیں اب صرف سونے کے لئے ہیں ــــــــ ہر طرف ایک خاموشی ، گہری خاموشی ، ایک ہلکا ارتعاش ہے تو اس ایک لمحہ جب بڑی سڑک سے مڑتے ہی ٹیلہ پر یہ مزار دکھائی دیتا ہے ۔ مزار سے آتی ڈھول کی آواز رینگتی ہوئی سارے وجود میں پھیل جاتی ہے اور لمحہ بھر کے لئے سارا وجود ملبہ کا ڈھیر بن جاتا ہے جس کے نیچے دبا ہوا سپاہی جو شہر فصیل پر کھڑا دشمن پر تیر چلا رہا ہے اور اس کے پیچھے شہر کے دروازے پر دستک دیتا خرقہ پوش سر ابھارتے ہیں ۔

کیا یہ جاننے کا عمل ہے ؟

خرقہ پوش مسکراتا ہے ، پھر کہتا ہے ــــــــ "میرے شیخ نے مجھے

ایک حکایت سنائی تھی، تم بھی سنو ـــــــ ایک راہب روم کے کلیسا میں ستر سال سے گوشہ نشیں تھا۔ یشیخ اس کا ذکر سن کر روم میں اس کلیسا کے پاس پہنچے۔ راہب نے دریچے سے سر نکال کر کہا ـــــــ اے شخص تو یہاں کیا لینے آیا ہے۔ میں راہب نہیں ہوں بلکہ اپنے نفس کی جس نے کتے کی شکل اختیار کر لی ہے، نگرانی کرتا ہوں اور اس کو مخلوق کے شر سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ شیخ نے اس کے لئے دعا کی کہ اے خدا اس کو ہدایت دے۔ راہب بولا ـــــــ مردوں کی جستجو میں تم کب تک پھرتے رہو گے، گھر جا کر خود کو تلاش کرو اور جب اپنے آپ کو پالو تو اپنے نفس کی نگرانی کرو"۔

یہ اپنے کو پالینا ہی تو ایک عذاب ہے، آدمی جتنا کم جانے اتنا ہی اچھا ہے۔

بڑ کے درخت کے نیچے موت کی ٹھنڈی انگلیوں نے آہستگی سے سوکھی ہڈیوں کو چھوا، لیکن اسی لمحہ زندگی بھرے ہاتھوں نے سوکھے ہونٹوں پر دودھ کے قطرے چوائے ـــــــ تازہ دودھ کی چند بوندوں سے سوکھی انتڑیوں اور خشک ہڈیوں میں زندگی کونپل کی طرح مسکرائی، اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں،

"لاعلمی ایک نعمت ہے!"

نہ جاننے میں بھی ایک اسرار ہے، خوابوں کے پیچھے بھاگتے جائیں، دھند کے ساتھ دھند ہو جائیں ـــــــ تین سمتوں کی پہچان اور چوتھی سمت کا اسرار"

ہرن کنوتیاں اٹھا بھاگا، شہزادہ افتاں و خیزاں پیچھے پیچھے،

راستہ ہے کہ ختم ہوتے میں ہی نہیں آتا، رات آگئی، شبِ ماہ پورن ماسی کا چاند اور ہرن ہے کہ چوکڑیاں بھرتا چلا جاتا ہے ـــــــ دفعتہً جنگل ختم ہوا، کیا دیکھتا ہے کہ سامنے ایک پر فضا باغ ہے جس کے بیچوں بیچ ایک

بارہ دری کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن یہ جنگل تو ختم ہوتے ہی میں نہیں آتا ، آخر پہ پہنچتا ہوں تو پھر پہلا سرا آجاتا ہے ، ایک دائرہ ،۔۔۔۔۔۔

صبح چھ بجکر پندرہ منٹ پر الارم کے ساتھ اٹھنا ، شیو ، دانت صاف کرنا ، ناشتہ ، بچوں کو سکول چھوڑنا دفتر ۔۔۔۔۔ ایک فائل ، دوسری ، تیسری ، بچوں کو سکول سے لینا ۔۔۔۔۔ گھر واپسی کھانا ، سونا ، اُٹھ کر ٹی وی دیکھنا ۔۔۔۔۔ رات سونا ، صبح پھر وہی چھ بجکر پندرہ منٹ پہ الارم کی آواز ۔۔۔۔۔۔

ایک ہی راستہ ۔۔۔۔۔ یوں ہی برسوں بیت گئے ہیں ،

لیکن بڑی سڑک کا موڑ مڑتے ہی ڈھول کی ہلکی سی آواز نے میرے سوئے وجود میں چٹکی سی لی ہے ۔ میں نے چونک کر دیکھا ، ایک پتھر پر جس کا ایک کونہ بڑی سڑک کی طرف باہر کو نکلا ہوا ہے کوئلہ سے لکھا ہے ۔۔۔۔۔۔ شیخ ابوبختیار مشہدی ۔۔۔۔۔ میری نظریں اوپر اٹھتی گئیں ۔ مزار رنگ برنگی جھنڈیوں سے جگمگا رہا تھا ۔ مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس کا مزار ہے ؟ میرے قدم اوپر اُٹھتے گئے ۔ تالاب کی سمت والی منڈیر پہ ایک شخص جھکا ہوا تالاب کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ میرے قدموں کی چاپ پر اُس نے سر اٹھایا ،

میں نے پوچھا ۔۔۔۔۔ "آپ کون ہیں"

اس کے ہونٹوں پہ ایک پر اسرار تبسم ابھرا ۔۔۔۔۔۔ "میں ابوبختیار مشہدی ہوں"

میں نے پوچھا ۔۔۔۔۔۔ "یا شیخ آپ مشہد سے یہاں پہنچے ، اتنی دور ۔۔۔۔۔ مٹی نے کہیں آپ کے پاؤں نہیں پکڑے "

شیخ ایک لمحے چپ رہے پھر بولے ۔۔۔۔۔ "مٹی کی پکڑ بڑی سخت

ہے لیکن یہ دل کی آواز عجیب چیز ہے ، اس کی لے میں جو بے چینی اور اضطراب ہے وہ آدمی کو کشاں کشاں لئے پھرتی ہے"

"بے چینی اور اضطراب" کوئی میرے اندر کسمساتا ہے ،

میں نے کہا ـــــــ "یا شیخ میرا اضطراب اور بے چینی کہاں گئے ؟"

شیخ بولے ـــــــ "ایک شخص تیس سال تک مرشد کی صحبت میں حاضر رہا اور ایک دن عرض کی کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود آپ کی تعلیم مجھ پر اثر انداز نہیں ہوئی ، مرشد نے فرمایا کہ ایک ہی صورت سے تجھ پر اثر ہو سکتا ہے لیکن وہ تجھے قبول نہیں ہوگی۔ اُس نے عرض کی کہ میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ مرشد نے فرمایا ، اپنے بال منڈوا کر ایک کمبل اوڑھ اور ایک تھیلے میں اخروٹ بھر لے اور ایسی جگہ جا بیٹھ جہاں بہت لوگ تجھ سے واقف ہوں اور بچوں سے کہہ دے کہ جو بچہ مجھے ایک تھپڑ مارے گا اسے ایک اخروٹ دوں گا ، بس یہی تیرا علاج ہے ، اس لئے کہ ابھی تجھے اپنے نفس پر قابو حاصل نہیں ہو سکا"

میں نے شیخ سے یہ نہیں پوچھا کہ مرید نے مرشد کو کیا جواب دیا ،

زندگی کے اس تسلسل میں ہر سوال کا جواب ضروری بھی نہیں ہوتا ـــــــ زندگی ہے ہی عجیب شے ، اتنی مضبوط کہ ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ ، اور اتنی کمزور کہ ایک سانس کے بعد دوسرا سانس غائب ہو جائے تو سب کچھ ختم ـــــــ کائنات کی اس وسعت میں زندگی کے کیا معنی ہیں ؟ ایک ذرہ ، یا شاید اس سے بھی زیادہ بے وقعت ، کیا معلوم یہ کائنات بھی کسی نقطہ پر جا کر ذرے کی طرح بے وقعت ہو جاتی ہو ، یا اپنے ہی ہاتھوں خود کو فنا کر لیتی ہو ، ایک نئے آغاز کے لئے ـــــــ

تو یہ سب کچھ ایک سفر ہی ہے ، ایک طویل سفر ، شیخ مشہد سے یہاں پہنچے اور مٹی کہیں ان کے پاؤں نہ پکڑ سکی ، لیکن کئی لوگ تو مٹی کی گرفت سے نکل ہی نہیں پاتے ،

ساری عمر انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا ہیں، جہاں پیدا ہوتے وہیں مر گئے، یا شائد جس لمحے پیدا ہوئے اُسی لمحے مر گئے،

یہ ساری تگ ودو تو خود کو جاننے پانے کی ہے ——— سارا کھیل ظاہر اور باطن کا ہے ——— ایک پر اسرار آنکھ مچولی،

ایک بار شیخ کو راہ میں ایک کتا ملا۔ آپ نے دامن سمیٹ لیا۔ اس پر کتا بولا ——— آپ نے دامن کیوں بچایا، اس لئے کہ اگر میں بھیگا ہوا نہیں ہوں تو مجھ سے ناپاکی کا کوئی خطرہ نہیں اور اگر بھیگا ہوا ہوتا تو آپ اپنے کپڑے پاک کر سکتے ہیں لیکن یہ تکبر جس کا مظاہرہ آپ نے فرمایا یہ تو سات سمندروں کے پانی سے بھی پاک نہیں ہو سکتا، آپ نے فرمایا تو سچ کہتا ہے اس لئے کہ تیرا ظاہر نجس ہے اور میرا باطن،

مجھے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ میرے ظاہر اور باطن میں کون زیادہ نجس ہے لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ ظاہر بڑا پر سکون اور خاموش ہے اور باطن میں نہ تھمنے والا طوفان ——— جس کی زد میں، میں ایک تنکے کی طرح ہوں، جیسے کائنات اوپر سے خاموش اور اپنے مرکزہ کی پابند دکھائی دیتی ہے،

شیخ ابو المختار مشہدی ٹوٹی منڈیر سے تالاب میں تیرتی بطخوں کو دیکھ رہے ہیں،

میں نے پوچھا ——— "اے شیخ یہ فنا اور بقا کا کیا فلسفہ ہے"؟

شیخ نے تالاب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو میں نے دیکھا ان کی ہتھیلی پر شعلہ پھڑ پھڑا رہا ہے، پھر شیخ نے گرم تنور میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو اس پر برف کا ایک ٹکڑا چمک رہا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا

وہ مسکرائے ـــــ "فنا اور بقا ایک ہی سلسلے کی دو سمتیں ہیں"

پھر ذرا توقف کے بعد بولے ـــــ "ایک شخص نے اپنے مرشد سے کہا، حضور تنور گرم ہے، مرشد نے جواب نہ دیا، اس نے تین بار کہا، حضور تنور گرم ہے، مرشد نے جھلا کر کہا تو جاؤ اس میں جاکر بیٹھ جاؤ۔ کچھ دیر بعد انہیں خیال آیا کہ انہوں نے کیا کہہ دیا ہے۔ فرمایا، جاؤ تنور میں جاکر دیکھو، جب تنور تلاش کر کے دیکھا تو وہ شخص اندر بیٹھا ہے اور آگ نے ایک بال بھی نہیں جلایا"

شیخ خاموش ہو گئے، پھر بولے ـــــ "اصل چیز وجود نہیں وجود کا احساس ہے"

لیکن خود کو محسوس کرنا کیا اتنا ہی آسان ہے؟

میں نے جب بھی خود کو محسوس کرنے کی کوشش کی ہے ایک عجیب طرح کی افراتفری نے آن گھیرا، یوں لگا جیسے بہت سی چیزیں، کیفیتیں اور جذبے بکھرے پڑے ہیں، جنہیں زبان اور ترتیب دینا میرے بس میں نہیں ـــــ شہر کے دروازے پر دستک دیتا خرقہ پوش اور فصیل شہر پر خون بہاتا سپاہی مدھم ہوتے، ہوتے دھندلے نشانوں سے بھی کہیں پرے چلے گئے ہیں ـــــ ان کے آگے ایک بنجر میدان ہے جس میں کبھی کبھار ٹمٹماتی یادوں کے کچھ دئے روشن ہو جاتے ہیں ـــــ ہرنی کی سی چال والی وہ، جس کے جوڑے کا زرد پھول آج بھی یادوں کی جھیل میں تیرتا تیرتا میری آنکھوں کے کسی کونے میں نمی بننے لگتا ہے، وہ ہمیشہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جیسے میرے سوال کی منتظر ہو ـــــ میں اس سے اپنا آپ واپس مانگنا چاہتا تھا، لیکن لفظوں نے کبھی میرا ساتھ نہ دیا، بوند بوند حرف اکٹھے کر کے لفظ بناتا لیکن یہ لفظ جملے نہ بن پائے ـــــ اور یوں ہی یونیورسٹی کے دو سال بیت گئے، وقت

کے جواری ہاتھوں نے ہمیں پھینٹ کر زمانے کی شطرنج پر پھینک دیا۔ دیوار پر لگے کیلنڈروں کے کئی ہندسے ٹوٹ ٹوٹ کر وقت کی ڈسٹ بن میں گر گئے، بہت سے چہرے دھندلا گئے لیکن اب بھی آنکھوں کے کسی کونے میں ایک نمی سی محسوس ہوتی ہے جس کے شفاف بدن میں سے زرد پھول لمحہ بھر کے لئے جھانکنے لگتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں اس کی مانوس خوشبو بھول گیا ہوں لیکن کل جب ایک دکان سے نکلتے ہوئے وہ اچانک میرے سامنے آ گئی تو وہی خوشبو، مانوس خوشبو مجھ سے لپٹ گئی۔ ہم دونوں ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکے، پھر وہ اپنے بچوں کو لے کر اندر چلی گئی، میں اپنے بچوں کو لے کر باہر نکل آیا۔

اس شام میں نے شیخ سے پوچھا ——— "اگر دریا ایک ہی ہے تو لہریں ایک دوسرے سے دور کیوں ہو جاتی ہیں، کوئی آگے نکل جاتی ہے کوئی پیچھے رہ جاتی ہے"

شیخ نے تالاب سے نظریں ہٹائیں اور بولے ——— "یہ تو صرف نظر کا فریب ہے۔"

میں نے کہا ——— "اگر یہ محض فریب ہے تو پھر یہ بے چینی کیسی؟"

شیخ بہت دیر چپ رہے پھر کہنے لگے ——— "ایک شخص روتا ہوا مرشد کے پاس آیا اور عرض کی کہ یا حضرت میں نے بڑی محنت، عبادت اور ریاضت کے بعد ایک خاص انجذابی کیفیت حاصل کی تھی۔ اس میں بڑی لذت اور آسودگی تھی لیکن چند دنوں سے میں اس حلاوت اور جذب سے محروم ہو گیا ہوں، مرشد نے فرمایا ——— دنیا چھوڑ دینے کے بعد تم پھر اس کے وسوسوں میں گھر گئے ہو اور غیر یقینی سوچوں نے تمہارے باطن کو

ہلا دیا ہے"

سنسان سڑک، راستہ دھندلایا ہوا، وسوسہ دبے پاؤں آتا ہے اور پلک جھپکنے میں چاروں طرف چھا جاتا ہے، خود کو محسوس کرنے کے لئے ایک لمبی ہیبتیج، لیکن جواباً چُپ، گہری چُپ،

مرید نے مرشد سے سوال کیا، مرشد خاموش رہا، مرید نے پھر سوال کیا،

مرشد اب بھی چُپ رہا، مرید نے کہا ـــــ پہلے تو ایسا نہیں تھا کہ آپ نے میرے سوالوں کا جواب نہ دیا ہو۔ مرشد نے جواب دیا، ایک وقت وہ آتا ہے جب سکوت کرنا پڑتا ہے اور یہ بات سمجھ لو کہ نظر کے بعد خبر کی ضرورت نہیں رہتی، تب خبر اور وقت دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں،

رات گئے دروازہ کھولتے ہوئے بیوی کا وہی پرانا جملہ ـــــ "یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا"

مجھے آج تک علم نہیں ہو سکا کہ گھر آنے کا وقت کون سا ہے اور گھر کیسے پاؤں پکڑتا ہے۔ یونیورسٹی کے زمانے میں دن پڑھنے میں گزر جاتا اور رات کو کسی چائے خانے میں سارے دوست اپنے اپنے زرد پھولوں کی یاد تازہ کرتے۔ رات گئے دروازہ کھولتے ہوئے ماں روز کا جملہ دہراتی ـــــ "یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا" ماں کا خیال تھا کہ شادی کے بعد میرے پاؤں گھر میں رک جائیں گے لیکن شب گردی اور سنسان سڑکوں پر درختوں، کھمبوں اور اپنے آپ سے مکالمہ کرنے کا نشہ عجیب ہے کہ جاتے نہیں جاتا۔ معلوم نہیں تنہائی میں اتنی لذت کیوں ہے۔ ایک بستر میں برسوں اکٹھے سونے کے باوجود کوئی نہ کوئی لمحہ یا مقام ایسا ضرور ہوتا ہے جہاں ترسیل نہیں ہوتی۔ اس لمحہ اُس

مقام پر ہر ذات تنہا ہوتی ہے، اپنے دُکھ کے ساتھ کسی زرد پھول، کسی سرخ ٹائی
کی یاد کے ساتھ، لیکن یہ یاد تو تلوار کی طرح ہے جو ہمیشہ سر پر سونتی رہتی ہے
کہتے ہیں کسی بادشاہ نے مجنوں کو بلایا اور پوچھا تجھے کیا ہو گیا ہے اور تجھ
پر کیا افتاد پڑی ہے کہ تو نے خود کو رسوا کیا۔ لیلیٰ کیا ہے، اس میں کیا خوبی ہے،
آ میں تجھے حسین ترین دوشیزائیں دکھاؤں اور ان کو تجھ پہ قربان کروں اور انہیں تجھ
کو بخش دوں۔ جب یہ حسین ترین دوشیزائیں حاضر ہوئیں تو اپنی اداؤں میں سرمست
تھیں۔ مجنوں اپنے حال میں تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ بادشاہ نے کہا ــــــــ
اب ذرا نظر اٹھا اور ان دوشیزاؤں کو دیکھ۔ مجنوں نے جواب دیا ــــــــ میں ڈرتا
ہوں کیونکہ لیلیٰ کا عشق تلوار سونتے کھڑا ہے۔ میں نے سر اٹھایا تو وہ ایک ہی
وار سے اُسے اڑا دے گا، اور اے بادشاہ تو نے یہ جو پوچھا کہ لیلیٰ کیا ہے تو جان
لے کہ لیلیٰ جسم نہیں نور ہے اور یہ بھی جان لے کہ اگر ساری دنیا نور سے بھر جائے
پھر بھی جب تک اپنی آنکھوں میں نور نہ ہو نور نظر نہیں آئے گا،

اور جب یہ نور نظر آنے لگتا ہے تو اپنے نام کی پکار سنائی دیتی ہے،

"یا شیخ ــــــــ یہ کیا اسرار ہے کہ پکارنے والا پکارے جاتا ہے لیکن
سامنے نہیں آتا"

شیخ نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر بولے ــــــــ "پکارنے والا سننے والے
سے علیحدہ نہیں، اور اپنے آپ کو دیکھنا بہت مشکل ہے"

پروفیسر نے عینک ٹھیک کی اور کہنے لگے ــــــــ "ذہن کے دو حصے ہیں،
دائیں طرف والا اور بائیں طرف والا، ایک پرانا اور دوسرا نیا ذہن۔ پرانا ذہن
اجتماعی لاشعور ہے پوری انسانیت بلکہ پوری کائنات کی تاریخ، ایک لائبریری، ایک
دفینہ ــــــــ نیا ذہن جدید عہد اور نئے امکانات کی دنیا ہے یعنی شعور

دونوں کے درمیان ایک رابطہ ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔کنٹرولنگ اتھارٹی ۔۔۔۔۔۔جب کبھی اس رابطے میں کوئی بحران پیدا ہو جائے تو پرانے ذہن سے چیزیں سرک کر نئے ذہن میں آجاتی ہیں ۔ سارا معمول غیر معمول بن جاتا ہے ، پراسرار آوازیں سنائی دیتی ہیں ، چیزوں کے نئے چہرے ، نئے معنی دریافت ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ کشف و کرامات ۔۔۔۔۔۔ اسرار ، آوازیں ۔۔۔۔۔۔۔ جو اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہیں ،

باتیں ۔۔۔۔۔۔۔ جو سمجھ میں نہیں آتیں ،

کیا ایک دوسرے کی باتیں سمجھنا ضروری بھی ہے ؟ ہم سب زندگی کو اپنے اپنے دریچے سے گزرتے دیکھتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کے ساتھ یہ شرکتیں کیا ؟ اور کیوں ؟ ایک نہ ایک لمحہ یا مقام تو ضرور ایسا ہے جو صرف اور صرف اپنا ہوتا ہے ، جہاں کوئی دوست ، ماں باپ ، بیوی بچے شرکت نہیں کرتے ، تنہائی کا ایک لمحہ ، اپنا لمحہ ۔

میں اس ایک لمحہ کی لذت میں گم رہنا چاہتا ہوں ، زندگی کی سنسان سڑک پر خاموشی سے چلتے جانا اور ایک دن نیستی کی دھند میں ڈوب جانا ، لیکن یہ جو کبھی کبھی مڑ کر دیکھنے کی خواہش ہے ، ماضی کے مشفق ہاتھ کی گرم گرم تھپک ۔۔۔۔۔۔۔ بڑی سڑک کے موڑ پر تالاب کے کنارے اونچے ٹیلے پر مزار ، مزار سے اٹھتی ڈھول کی مہکتی تھاپ ، منڈیر پر جھکے شیخ ابوالبختیار مشہدی اور تالاب میں ڈوبتے سورج کا عکس ،

"یا شیخ ۔۔۔۔۔۔۔۔ " یہ ماضی ، حال اور مستقبل کا کیا اسرار ہے ، ہم کہاں زندہ رہتے ہیں اور کہاں فنا ہو جاتے ہیں " ؟

شیخ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز پراسرار تبسم ابھرا ، بولے ۔۔۔۔۔۔ "وقت

ایک دریا کی مانند ہے جس کی لہروں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ دیکھنے میں
وہ الگ الگ نظر آتی ہیں، ماضی کی گود سے حال، حال کی گود سے مستقبل اور مستقبل
کی گود سے پھر ماضی طلوع ہوتا ہے، ایک دائرہ جس کا ایک مرکز ہے اور اس مرکزہ
کی کوئی زبان نہیں نہ کوئی اس کا احاطہ کر سکتا ہے"

میں نے پوچھا ــــــــ "تو اے شیخ اس دائرے کا تسلسل کیا ہے"
شیخ نے ذرا توقف کیا پھر کہا ــــــــ "فہم انسانی اس تسلسل تک رسائی
نہیں رکھتی، اس کی رسائی تو عام درجے تک بھی نہیں،
حقیقتہ الحقیقتہ اور حق الحقیقتہ تک اس کا پہنچنا ناممکن
ہے، اس کے لئے نفس کو فنا کرنا پڑتا ہے"
میں اپنے نفس کو فنا نہیں کر سکا، اس لئے میں اس بھید کو نہیں پا سکا۔
میں نے پوچھا ــــــــ "اے شیخ آپ نے تو اس بھید کو پا لیا ہوگا"
شیخ نے ٹھنڈی آہ بھری ــــــــ "وہ خرقہ پوش مشہد کی خاک سے اٹھا
اور مرشد کے حکم کے مطابق مسافتیں طے کرتا اس شہر کے دروازے پر پہنچا،
اسی ٹیلہ پر اس نے چلہ کاٹا اور یہیں خاک ہو کر مٹی میں ملا ــــــــ برسوں
بعد اسی خاک سے اس جواں مرد نے جنم لیا ــــــــ
شہر کی حفاظت کرتے فصیل پہ جان دی، پھر اسی لہو سے اب برسوں
بعد ــــــــ"

میں نے بے چینی سے پوچھا ــــــــ "اور اب برسوں بعد ــــــــ
کون ــــــــ اے شیخ کون ہے؟"
شیخ کچھ نہ بولے، لمحہ بھر کے لئے میں نے خرقہ پوش کی دستک سنی، فصیل شہر
پر بہتے تازہ لہو کی مہک، چائے خانے کی میز پر مکہ مار کر بحث کرتے جوان کی

آوازیں ——— منظر سمٹ کر، ایک نقطہ بن کر شیخ کے وجود میں سما گئے،

میں نے کہا ——— "اے شیخ اگر وہ خرقہ پوش، وہ جواں مرد، وہ جواں سب آپ ہیں تو میں کیا ہوں؟"

شیخ نے مجھے دیکھا، بولے ——— "ایک مرتبہ کُل جہان کے پکھیرو سی مرغ کی تلاش میں نکلے۔ برسوں بعد جب وہ تپتے صحراؤں، برفانی پہاڑوں اور موت کی سات وادیوں سے گزر کر کوہ کاف پر پہنچے تو لاکھوں میں سے صرف تیس باقی رہ گئے۔ یہ تیس پرندے مختلف دروازوں سے گزر کر آخر کار ایک ایسے پردے کے سامنے پہنچے جس کے پیچھے سی مرغ پوشیدہ تھا۔ پردہ اٹھا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے ایک آئینہ ہے جس میں ان کا اپنا عکس دکھائی دے رہا ہے"

میں نے سر اُٹھایا ——— وہاں کوئی نہیں تھا،
یا شیخ ——— یا شیخ

لیکن شیخ ابوالبختیار مشہدی کا کچھ پتہ نہیں تھا، مزار سنسان پڑا تھا، نہ کوئی جھنڈا، نہ ڈھول کی تھاپ، ہر طرف ایک ویرانی اور اداسی، شائد مدتوں سے وہاں کوئی نہیں آیا تھا اور میں نہ جانے کب سے ٹوٹی منڈیر پر جھکا اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہا تھا،

سمندر مجھے بلاتا ہے

مُرشد نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی ــــــ "اے خدا مجھے احدیت کے سمندر کی گہرائیوں میں داخل کر۔"

اُس نے تاسف سے سر ہلایا ــــــ "لیکن میں تو ابھی دنیا کے سمندر میں بھی نہیں اُتر سکا۔"

مُرشد مُسکرایا ــــــ "دنیا بھی تو وہی ہے۔"

اُس نے پوچھا ــــــ اگر دنیا بھی وہی ہے تو میں الگ کیوں ہوں؟"

مُرشد پھر مُسکرایا ــــــ "تم الگ کہاں ہو، سمندر تمہارے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔"

اُس نے اپنے آپ کو ٹٹولا ــــــ "لیکن میرے اندر تو خلاء ہے اور باہر ایک سناٹا۔"

مُرشد نے سر ہلایا ــــــ "یہ سب اس کی ادائیں ہیں۔"

اُس نے پوچھا ــــــ "کیسی ادائیں ــــــ یہ ادا ہے تو جفا کیا ہے؟"

مُرشد نے کہا ــــــ میں تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں، ایک مُرید نے اپنے شیخ سے کہا، اے شیخ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں، جو سچ ہی سچ ہے

شیخ نے ایک لمحہ تردد کیا پھر بولے ـــــــ "تو جاؤ وہ جو بلند پہاڑ ہے وہ تمہیں اس کی چوٹی پر ملے گا"۔ مرید کئی مسافتوں کی صعوبتیں سہتا چوٹی پر پہنچا تو دیکھا کچھ لوگ وضو کر رہے ہیں۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ وضو کر کے لوگ کسی کا انتظار کرنے لگے۔

اس نے پوچھا ـــــــ "اے لوگو تم کس کے منتظر ہو" ـــــ وہ بولے ـــــ "اس کے جو سچ ہی سچ ہے، وہی یہاں امامت کراتا ہے۔"

اتنے میں ایک شخص دائیں جانب سے نمودار ہوا۔ لوگ صفیں سیدھی کرنے لگے۔ آنے والا امام کی جگہ کھڑا ہو گیا۔ مرید نے بڑی کوشش کی کہ اسے دیکھے لیکن صفیں سیدھی ہو گئی تھیں اور وہ آخری صف میں تھا۔ نماز پڑھا کر جونہی امام سیدھا ہوا تو مرید نے دیکھا وہ تو شیخ ہیں۔ دوڑ کر ان کے قریب گیا اور کہا ـــــــ "شیخ اگر یہ آپ ہیں تو میرا یہ سفر کس لئے"؟

شیخ مسکرائے ـــــــ "بغیر جستجو کے سچ بھی سچ نہیں رہتا"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

مرشد نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو"؟

اُس نے کہا ـــــــ "معلوم نہیں تماشا کیا ہے اور سچ کیا ہے"؟

مرشد ہنسا پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ پانی میں ڈال کر ایک زندہ مچھلی نکالی، پھر بایاں ہاتھ جلتے تنور میں ڈال کر اس میں سے بھی زندہ مچھلی نکالی اور کہنے لگا ـــــ "پانی میں سے تو ہر کوئی زندہ مچھلی نکال سکتا ہے۔ آگ سے زندہ مچھلی نکالنا اصل کام ہے"۔

اُس نے کندھے اچکائے ـــــــ "لیکن میں کیا کروں، میرے لئے تو پانی اور آگ میں کوئی فرق نہیں کہ سمندر میرے اندر بھی ہے اور باہر بھی"

مرشد نے سر ہلایا ـــــــ "سمندر تو آگ بھی ہے اور پانی بھی، بس انا الخیر اور انا الحق کا فرق ہی سارا تماشا ہے۔ اور سارے راستے فنا کی طرف جاتے ہیں"۔

اُس نے پوچھا ــــــــــ "فنا کیا ہے ؟"

مُرشد کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ اُبھری ــــــ "فنا جانا ہے اور جاننے کے سارے راستوں میں لوگ کھڑے ہیں۔"

اس نے انگلیوں پر گنا ــــــ "بیس تو ہو ہی جائیں گے"۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے" بیوی نے غصہ سے کہا ــــــ "آخری تاریخوں میں بیس آدمیوں کی چائے کا بندوبست کیسے ہوگا ؟"

"لیکن"

"لیکن کیا، اب یہ چونچلے چھوڑو ــــــــ دودھ سات روپے اور چینی دس روپے کلو ہو گئی ہے، آخر اس کی ضرورت کیا ہے ؟"

وہ ایک لمحہ چپ رہا پھر بولا ــــــــ "ضرورت تو ہے، بڑا صاحب نیا نیا آیا ہے۔ اسی بہانے پی۔ آر ہو جائے گی۔ نوکری کرنا ہے تو سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

اور اسے خیال آیا اسی بہانے سٹینو سے ملاقات کی صورت بھی نکل آئے گی ــــ

"آؤ گی نا ــــــــــ"

"آ بھی جاؤں تو کیا ــــــــ تمہارے اردگرد تمہارے بیوی بچے ہوں گے، میں آؤں بھی تو کس کے لئے ــــــ اندر ہی اندر سُلگنے کے لئے ؟"

مُرشد کھلکھلا کر ہنسا ــــــــ "اندر ہی اندر سُلگنے کا اپنا ہی ایک مزہ ہے"

"لیکن جب کوئی اُمید ہی نہ ہو ؟"

مُرشد نے اسے گھورا ــــــــ "اُمید اندھیرے میں کھویا ہوا راستہ ہے۔"

"لیکن صبح کب ہوگی" ؟ وہ بُڑبڑایا

"ابو آپ ہمیشہ دیر کر دیتے ہیں، میڈم کہتی ہیں اگر کل سے وقت پر نہ آئیں تو کلاس میں نہیں بیٹھنے دوں گی۔"

بیوی نے ناشتہ لگاتے ہوئے بھنویں سکیڑیں ——— "رات کو جلد سوئیں تو صبح وقت پر آنکھ کھلے نا ——— پتہ نہیں کیا کرتے رہتے ہیں، کبھی ایک کمرے میں جاتے ہیں، کبھی دوسرے میں، خدا جانے کیا بے چینی ہے؟"

"بے چینی روح کی طلب ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا "اور جانے میں کسے ڈھونڈتا ہوں، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں وہ ہے کہاں؟"

"کہیں بھی نہیں اور ہر جگہ" مُرشد نے آہستہ سے کہا ——— "بس اپنی عینک کے نمبر ٹھیک کر لو۔"

سٹینو نوٹس لے کر جانے لگی تو اُس نے کہا ——— "آج مجھے عینک بدلوانا ہے شام کو ملو تو کہیں بیٹھ کر چائے پی لیں۔"

وہ ایک لمحہ چُپ رہی، کچھ سوچا، پھر شانے اچکائے ——— "ٹھیک ہے۔"

خوشی بے فکرے پرندے کی طرح اس کے وجود کے آسمان پر لمبی نیلی لکیر بناتی کہیں خلا میں کھو گئی۔

"اسے پا بھی لیا تو کیا، نہ پایا تو کیا ——— شاید زندگی پانے ہی کے راستوں میں کہیں کوئی چھوٹا سا وقفہ ہے۔ اس وقفہ سے جلدی سے گزر جانا ہی اچھا ہے"

"لیکن اتنی مایوسی بھی کیوں؟" وہ پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے اسے مسلسل دیکھے گئی۔

"یہ بھی کیا ملنا؟" اس نے ٹھنڈی آہ بھری ——— "تھوڑی سی خوشی، پھر وہی گھر وہی ———؟"

"تم اتنے بیزار کیوں ہو، وہاں تمہاری بیوی ہے بچے ہیں۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"کبھی کبھی سوچتی ہوں، یہ راستے بھی کتنے عجیب ہیں، کہاں کہاں سے گھوم کر پھر ایک دوسرے میں جا چھپتے ہیں۔"

"تمہارے رشتے کی بات کیا ہوئی؟"

"چل رہی ہے۔"

"پھر تو ——— تم مجھ سے نہیں ملو گی۔"

"کتنا عجیب ہے ایک ایسی عورت جسے تم نہیں چاہتے اور ایک ایسا مرد جسے میں نہیں جانتی ——— لیکن ہم ایک دوسرے کو اپنی جھوٹی محبتوں کا یقین دلاتے رہیں گے۔"

"زندگی ایک جھوٹ ہی ہے، جس کا یقین دلاتے دلاتے عمر بیت جاتی ہے۔"

وہ خاموشی سے چائے پیتی رہی، پھر بولی ——— "اب کوئی بھی ملاقات آخری ہو سکتی ہے، شاید یہی۔"

اس نے سر اُٹھایا

وہ ناخن سے پرچ کریدتے ہوئے بولی ——— "کیا معلوم وہ مجھے نوکری بھی کرنے دیتے ہیں یا ———"

دونوں چُپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

دفعتہً وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ——— "یہ تو آخر ایک دن ہونا ہی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے ——— "تم کتنی بے رحمی سے یہ بات کہہ رہے ہو" ——— پھر ایک لمحہ چُپ رہی۔ "لیکن تم ٹھیک ہی کہتے ہو، یہ تو ایک دن ہونا ہی ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولی ——— "بیٹی کا اب کیا حال ہے؟"

"بخار تو اُتر گیا ہے ——— ارے یاد آیا مجھے اس کے لئے دوا لینی ہے۔"

بیوی نے دوا لیتے ہوئے اُس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا ——— "کیا بات ہے آج کل تم بہت اُلجھے اُلجھے ہو۔"

اس نے شانے اچکائے ـــــــ "دھند میں راستہ نہیں مل رہا۔"

مرشد مسکرایا ـــــــ دھند اور روشنی اُسی کے روپ ہیں اور راستہ گم ہو جائے تو نہ روشنی روشنی ہے نہ دھند دھند۔"

"لیکن میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں رہا ـــــــ "وہ بھی نوکری چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

مرشد نے اس کے شانے کو تھپتھپایا ـــــــ جب اپنے پاس کچھ نہیں ہوتا تو ساری چیزیں دور بھاگتی ہیں جتنا انکی طرف لپکو اور دور ہوتی جاتی ہیں، یہی تو اسے جاننے کا مرحلہ ہے۔"

"جان بھی گیا تو کیا کروں گا" اس نے تاسف سے سر ہلایا ـــــــ "میرا تو اپنا آپ بھی میرے لئے اجنبی ہوتا جا رہا ہے"

مرشد کے ہونٹوں پر ایک عجب مسکراہٹ اُبھری ـــــــ "اپنے آپ سے اجنبی ہونا، سفر کا آغاز ہے، مبارک ہو تمہارا سفر شروع ہوا۔"

پھر اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے ـــــــ "اے خدا مجھے احدیت کے سمندر کی گہرائیوں میں داخل کر۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کہہ نہ سکا، اُسے ایسا لگا جیسے سمندر اس کے اندر بھی ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور باہر بھی اور وہ تن تنہا اس کی وسعتوں میں بہتا ہی چلا جا رہا ہے ـــــــ

مرشد نے سسکاری بھری اور کہا ـــــــ "میں جب قبرستان میں داخل ہوتا ہوں تو مجھ پر ایک عجب مسرت انگیز کپکپی طاری ہو جاتی ہے"۔

اس نے پوچھا ـــــــ "کیسے؟"

مرشد نے کہا ـــــــ "مردے مجھے خوش آمدید کہتے اور جلد لوٹنے کی بشارت دیتے ہیں"۔

اس نے کہا ـــــــ "لیکن مجھے تو نہ کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سنائی ـــــــ میں تو سمندر میں بھی اترا تھا، لیکن اس نے مجھے پھر کنارہ پر اچھال دیا"

مرشد ہنسا ـــــــ "سمندر غیر کو اپنے اندر نہیں سموتا، تم غیر بن کر گئے تھے"۔

اُس نے پوچھا ـــــــ "اپنا کیسے بنا جا سکتا ہے"۔

مرشد کے تبسم میں ایک ٹھہراؤ آیا ـــــــ "کنارہ کی خواہش دل سے نکال دو، اور اس کی آواز سنو"

"لیکن کیسے؟" اُس نے مایوسی سے سر ہلایا ـــــــ "کچھ سنائی دے بھی تو"

"دیکھنے اور سننے کے لئے حوصلہ چاہیئے اور حوصلہ قدم قدم ریاضت کی دھول

ہے تم نے تو ابھی یہ سفر شروع ہی نہیں کیا"

اُس نے پوچھا ـــــــ "سفر کیسے شروع ہو گا؟"

مرشد نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر بولا ـــــــ "سفر شروع نہیں کیا جاتا، بس ہو جاتا ہے، ایک مرشد کی ضرورت ہے جو سفارش کرے۔"

اُس نے کندھے جھٹکے ـــــــ "فی الحال تو میرا معاملہ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن (ESTABLISHMENT DIV) میں اٹکا ہوا ہے، سینیارٹی ٹھیک ہو جائے تو پروموشن بھی ـــــــ چار پانچ سو کا ایک دم فائدہ"

مرشد نے نفی میں سر ہلایا ـــــــ "وہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں، اور یہ تو دنیاوی معاملہ ہے، میں تمہیں صرف مسرت انگیز بے کیفی سے روشناس کرا سکتا ہوں"

اس نے سر ہلایا ـــــــ "پہلے جی تو لوں، پھر لوٹنے کی بات بھی کر لوں گا"

"تم کبھی لوٹنے کی بات نہیں کر سکو گے"، مرشد نے تاسف کیا ـــــــ "تم بہتے دریا میں ایک کمزور تنکا ہو۔"

اُس نے کہا ـــــــ "دریا کی یہ حالت ہو تو تنکا کر بھی کیا سکتا ہے"

مرشد نے سر ہلایا ـــــــ "ٹھیک کہتے ہو، جب زوال ایک منہ زور سیلاب کی شکل اختیار کر جائے تو اسے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے نہیں روکا جا سکتا، اس کے لئے ایک بڑی فکر اور بڑی دانش کی ضرورت ہوتی ہے، اور ہم تو اب ایک فکری خلا میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں"

"فکر و دانش کو کیا ہوا؟"

"فکر و دانش کو تو کچھ نہیں ہوا ہم ہی IMMUNE ہو گئے ہیں"

اُس نے کہا ـــــــ "تو پھر ہم یہ مکالمہ کس لئے کر رہے ہیں؟"

مرشد مسکرایا ـــــــ "پھسلتی ڈھلوان پر اپنے قدموں کے جمے ہونے کے احساس کو برقرار

رکھنے کے لئے ـــــــ لیکن پھسلتی ڈھلوان اور اس کے نیچے اندھی کھائی نہ کچھ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں، اور ہم لمحہ لمحہ اس میں گر رہے ہیں، یہی ہمارے عہد کا مقدر ہے"

وہ چند لمحے چُپ رہا پھر بولا ـــــــ "لیکن میں گرنے سے پہلے ڈھلوان کے منظروں کو دیکھنا چاہتا ہوں، دنیا کو اسی کے حوالہ سے سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"تم دنیا کو سمجھنے لگو تو مجھے اور کیا چاہیئے"۔ بیوی نے ہونٹ سکوڑے ـــــــ "تمہاری پوسٹ والوں نے دو دو کوٹھیاں بنا لی ہیں اور تم ابھی تک کرائے کے مکان میں پڑے ہو"

اس نے شانے سکوڑے ـــــــ "کیا فرق پڑتا ہے، جنہوں نے کوٹھیاں بنا لیں اور جو کرائے کے مکان میں ہیں، زندگی تو سبھی کی گزر رہی ہے"

بیوی نے غصہ سے سر ہلایا ـــــــ "ایسی درویشی ہے تو کرائے کا مکان بھی کس لئے فٹ پاتھ ہی کافی ہے۔ آخر وہاں بھی تو لوگ رہتے ہی ہیں"

اس نے ٹھنڈی آہ بھری ـــــــ "کیا کروں ایسا درویش بھی نہیں، کاش کسی ایک طرف تو ہو جاتا ـــــــ آدھا دل ایک طرف ہے اور آدھا دوسری طرف، بس یہ دل کا معاملہ ہی تو عجیب ہے"

بیوی چند لمحے اسے گھورتی رہی پھر دفعتہ بولی ـــــــ "تمہاری سٹینو ملی تھی"

"کہاں ـــــــ کیسی تھی"؟ اس نے بے تابی سے پوچھا

"تمہیں اتنی دلچسپی کیوں ہے"؟

اُس نے بیوی کو غور سے دیکھا، ایک لمحہ کے لئے محسوس ہوا جیسے وہ سب کچھ جانتی ہے۔

ابو! انہوں نے مجھے اور بھائی کو ٹافیوں کا پیکٹ بھی لے کر دیا تھا"

"اچھا ——— لیکن وہ تم لوگوں کو ملی کہاں "۔

"مارکیٹ میں ——— اپنے میاں کے ساتھ "،

"کیسا ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"بڑی خوبصورت جوڑی ہے" بیوی کی نظریں اس پر مسلسل جمی ہوئی تھیں ، پھر اس نے ٹھنڈی آہ بھری ——— "کبھی تم بھی اسی طرح مجھے ساتھ لے جاتے تھے ، کیا زمانہ تھا"

"ابو انکل تو بہت اچھے ہیں ، بڑے خوبصورت ، ہے نا امی" بیٹی ٹافیوں کا پیکٹ دکھاتے ہوئے بولی ۔

ایسے لگا جیسے کوئی سیاہ چیز تیزی سے اس کے سارے چہرے پر پھیلتی چلی جا رہی ہے ۔

"کیا سوچ رہے ہو!" بیوی کی آواز میں بڑی گہرائی تھی ۔ اس نے غور سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی لیکن سارے لفظ گڈ مڈ تھے ، کچھ سمجھ نہ آیا ۔

شائد وہ سب کچھ جانتی ہے ، یا شائد کچھ بھی نہیں ——— خدا جانے

اُس نے تذبذب میں سر ہلایا اور اپنے اندر گھنے جنگل میں اتر گیا ۔ گھنے درختوں کی ہری خوشبو چاروں طرف پھیل گئی ۔ اس کا بدن ہریالی کے ذائقہ سے یکدم جاگ اٹھا ، ایک لمبی سانس ——— تنہائی بھی کیا چیز ہے ، آدمی چاہے تو بھرے مجمعے میں تنہا ہو جائے ، ساری آوازیں یکدم سکوت میں بدل جاتی ہیں ۔ پاس ہی سے ایک پرندہ پھڑ پھڑا کر نکلا اور دل آنگن میں ناچنے لگا ۔ مرلی کی تان چاروں طرف بکھر گئی ۔

وہ تانوں کی لہروں پر قدم رکھتی آہستگی سے قریب آئی ۔

"تو تم خوش ہو" اس نے آنسوؤں بھری آواز میں پوچھا ۔

"تمہیں میری خوشی پسند نہیں" اس کا چہرہ بھی آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔

"تمہاری خوشی" ـــــــ وہ بڑبڑایا ـــــــ "میں کتنا کمینہ ہوں تمہاری خوشی سے بھی جلتا ہوں"۔

اور اسے لگا سارا کچھ ایکدم بھڑکتی آگ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ دونوں آگ کی موسیقی پر ناچ رہے ہیں اور شعلوں کی لپکتی زبانیں ان کے چاروں طرف دھمال ڈال رہی ہیں۔

یکدم رقص تھم گیا، گہری خاموشی چھا گئی ـــــــ موت ایسی خاموشی۔

اُس نے گھبرا کر سر جھٹکا ـــــــ "کیا ہوا؟"

"میں تو بول بول کے بھی تھک گئی" بیوی نے بیزاری سے کہا ـــــــ "اب تو تم نے ہوں ہاں کرنا بھی بند کر دیا ہے"۔

چند لمحے وہ چپ رہی پھر بولی ـــــــ "سمجھ نہیں آتا تمہیں ہوا کیا ہے کبھی تم ـــــــ" اسکا گلا رندھ گیا ـــــــ "اب تو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے"۔

اسے اپنا آپ اجنبی سا لگا ـــــــ ٹھاٹھیں مارتا سمندر یکدم دور چلا گیا مرشد کی آواز دھیمی پڑ گئی ـــــــ اُس نے سر اٹھا کر غور سے بیوی اور پھر بچوں کو دیکھا ـــــــ "واقعی مجھے کیا ہو گیا ہے ـــــــ میں کس راستہ پر آنکلا ہوں"۔

چاروں طرف ایک گہری دھند سی ہے۔ جس میں اس کا اپنا آپ بھی سائے کیطرح لگ رہا ہے ـــــــ پھسلتی ڈھلوان پر اکھڑے قدموں کا تکلیف دہ احساس، وہ کسے آوازیں دے رہا ہے، سمندر تو اس کے اندر ہے، وہ باہر کسے تلاش کر رہا ہے ـــــــ

چاروں طرف دھند ہی دھند ہے،

بہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

بس دور کہیں وہ ایک لمحہ ہے، پھسلتی ڈھلوان پر قدم جمانے کا خوشگوار احساس، زوال کے منہ زور سیلاب کے سامنے ایک چھوٹا سا پتھر ـــــ

"یہ کیسا راستہ ہے ـــــ راستہ ہے بھی کہ نہیں"

ایک گہری دھند

"کیا سوچ رہے ہو؟" بیوی کی آواز دور کہیں سے آتی محسوس ہوئی۔

دھند کے اندر جھانکنے کی کوشش

اور دھند ـــــ اور دھند

چند لمحے یہی کیفیت رہی، پھر اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بیوی کے کندھے پر رکھا اور بولا ـــــ "کچھ بھی نہیں، بس یہ دو اہم فائلیں پینڈنگ (PENDING) ہیں، ان ہی میں الجھا ہوا ہوں"۔

بیوی نے یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا ـــــ "بچے آج کل آپ کو بہت مس کر رہے ہیں، آج انہیں ایوب پارک لے جائیں نا"۔

اس نے لمحہ بھر سوچا ـــــ دھند میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی ایک آخری سعی کی، کچھ دکھائی نہ دیا تو چند لمحے چپ رہنے کے بعد بولا ـــــ "ٹھیک ہے"۔

بچوں نے یک وقت ایک مسرت انگیز کلکاری ماری،

مرشد کھلکھلا کر ہنس پڑا ـــــ "یہی مسرت انگیز کلکاری وہ چھپا ہوا لمحہ ہے جسے تلاش کرتے عمریں بیت جاتی ہیں"۔

اور اسے لگا جیسے اس مسرت انگیز کلکاری نے چاروں طرف

پھیلی دھند میں دراڑ سی ڈال دی ہے، ایک چھوٹا سا دروازہ کھول دیا ہے، تازہ ہوا اور خوشبودار روشنی کا چھوٹا سا دروازہ ــــــ جس سے آگے چند ہی قدموں پر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر بولا "یہ کہانی بہت اُلجھی ہوئی ہے۔ اس لئے اُسے کسی ترتیب سے سنانا ممکن نہیں"۔

مرشد مسکرایا ــــــ "زندگی تو خود ایک بے ترتیب کہانی ہے۔ہم سارا وقت اُسے ترتیب دینے میں گزار دیتے ہیں اور تم نے سنا نہیں۔ جب چیزوں میں ضرورت سے زیادہ ترتیب پیدا ہو جائے تو وہ ٹوٹ جاتی ہیں"۔

اس نے پوچھا ــــــ "تو پھر میں کہانی کہاں سے شروع کروں؟"

مُرشد ہنسا ــــــ "کہانی تو شروع ہے ہیں اور تم اس کے چھوٹے چھوٹے کردار ہیں۔ جو اپنی مرضی سے نہ شروع کر سکتے ہیں۔ نہ ختم"۔

اس نے کہا ــــــ "اگر ہم اتنے بے بس ہیں تو پھر کیسی کہانی اور کیسے کردار؟"

مرشد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولا ــــــ "آؤ میں تمہیں اس کہانی کے شہر میں لے چلوں"۔

وہ شہر میں داخل ہوئے تو مرشد یکدم کہیں غائب ہو گیا۔

شہر اس کے سامنے تھا اور وہ اکیلا،

سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میدان کے قریب پہنچا۔ دیکھا کہ میدان کے درمیان میں ایک صلیب گڑی ہے۔ جس پر کوئی ٹنگا ہوا ہے، وہ گھبرا کر تیز تیز چلتا قریب پہنچا۔ صلیب پر ٹنگے نے اس کی چاپ سن کر آنکھیں کھولیں۔ اور مسکرا کر بولا ——— "تم بھی پتھر مارنے آئے ہو:"

اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ آگے کئے۔ "میرے تو ہاتھ ہی خالی ہیں۔ اور پھر میں کیوں پتھر ماروں گا؟"

صلیب والا ہنسا ——— "یہاں پتھر مارنے کے لئے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں، ایک کو دیکھ کر دوسرا بھی شروع ہو جاتا ہے۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا ——— "لیکن یہاں تو کوئی نہیں! لوگ کدھر چلے گئے:"

صلیب والا ایک لمحہ چُپ رہا پھر بولا: "وہ سارے واش بیسنوں کے سامنے کھڑے اپنے ہاتھ دھو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اس فیصلہ میں ان کا ہاتھ نہیں۔"

اس نے پوچھا "کس فیصلہ میں؟"

"مجھے مصلوب کرنے کا فیصلہ"

"اُن کا ہاتھ نہیں تو پھر یہ فیصلہ کس نے کیا ہے۔"

انہوں نے ہی، لیکن اپنی مرضی سے نہیں، بس ایک دوسرے کو دیکھ کر انہوں نے اپنے ہاتھ کھڑے کئے تھے یہاں یہی ہوتا ہے، یہاں کسی کو معلوم نہیں وہ کیا کر رہا ہے بس جو دوسرے کر رہے ہیں وہ بھی وہی کرتا ہے۔"

پھر اس نے آسمان کی طرف نظریں کیں ——— "اے خدا انکے کھیتوں میں فصلیں سرسبز اور لہلہاتی رہیں، ان کے دریاؤں میں پانی موجیں مارے اور ———"

وہ دعا کے باقی لفظ سُنے بغیر ہی وہاں سے بھاگ نکلا اور دوڑتا ہوا سڑک پہ آ گیا۔

لوگ ہر کام کرنے سے پہلے دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں:

اُسے لگا۔ وہ سارے کسی پر اسرار شے کی گرفت میں ہیں۔

کیا یہ جادُو کا شہر ہے۔

اور یہ سارے لوگ، لوگ ہیں بھی یا جادو کے پتلے ہیں۔

اگر یہ سارا کچھ جادو ہے تو سامری کہاں ہے؟

اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا ـــــــ یہ خواب تو نہیں۔

اگر خواب ہے تو کتنا طویل اور اکتا دینے والا کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا،

یہاں ہر شخص نے استری کیا ہُوا لباس پہنا ہُوا ہے۔ لیکن اندر شکنیں ہی شکنیں۔ وہ آہستہ آہستہ بڑے چوک میں ایستادہ مجسمہ کے سامنے پہنچ گیا۔ مجسمہ جگہ جگہ سے تڑخا ہوا تھا۔ اور اب اس کا ہیولا ہی باقی رہ گیا تھا۔

وہ دیر تک اس ہیولہ کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر اس نے پاس سے گزرتے ایک شخص سے پوچھا۔ "یہ مجسمہ کب ٹوٹا تھا"۔ اس شخص نے کچھ سوچا ـــــــ "یاد نہیں، مدت سے یونہی ہے"۔

اس نے پھر سوچا۔ "لیکن یہ تو تمہارا ہیرو تھا"۔

"شاید، ہاں ـــــــ لیکن ہمارا عہد بغیر ہیرو کا عہد ہے"۔

"بغیر ہیرو کا عہد"۔

"ہاں ہمارا ہیرو مدت ہوئی مر چکا۔ ہم نے اسے مار دیا۔ اب نئے ہیرو کے جنم لینے کا انتظار کر رہے ہیں"۔

"لیکن وہ کب جنم لے گا؟"

"کون جانے ـــــــ جنم لے گا بھی کہ نہیں" اس نے کندھے اُچکائے اور آگے بڑھ گیا۔

وہ وہیں ہیولہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

عجیب شہر ہے ــــــ ہر چیز کو اوپر سے چمکایا جا رہا ہے اور اندر سے وہ تڑختی چلی جا رہی ہے۔"

یہاں ہر شخص کا اپنا ایک جہنم ہے جس کا انتخاب اس نے خود کیا ہوا ہے۔

مرشد نے ہیولہ کے پیچھے سے سر نکالا ــــــ "یہ بیماروں کا شہر ہے لیکن ہر شخص خود کو تندرست سمجھتا ہے۔"

اس نے مرشد کا ہاتھ پکڑ لیا ــــــ "اس شہرِ بے وفا میں مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔"

مرشد نے اس کا کندھا تھپتھپایا ــــــ "میں تمہارے ساتھ تھا۔ ہر لمحہ۔"

اس نے کہا ــــــ "لیکن تم مجھے دکھائی کیوں نہیں دیئے۔"

مرشد ہنسا ــــــ "یہی تو اس شہر کی خصوصیت ہے، یہاں کسی کو اپنا آپ دکھائی نہیں دیتا۔ سارے دوسروں کو دیکھتے ہیں!"

اُس نے کہا ــــــ "تو پھر میں اس شہر سے نکلتا ہوں۔"

مرشد نے نفی میں سر ہلایا ــــــ "اس شہر سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔"

"کوئی راستہ نہیں" وہ خوف زدہ آواز میں بولا۔

مرشد لمحہ بھر چپ رہا۔ پھر بولا ــــــ "صرف ایک راستہ ہے۔"

"وہ کیا۔"

وہ جو صلیب پر ٹنگا ہے۔ اسے صلیب سے اتار دیا جائے اور اس کی جگہ کسی دُوسرے کو مصلوب کیا جائے۔"

"لیکن کیسے؟"

"جو شہر سے نکلنا چاہتا ہے۔"

"یعنی" ــــــ اُس نے خوف سے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ "لیکن میں مصلوب نہیں ہونا چاہتا۔"

مرشد نے اس کا کندھا دبایا "تو پھر جو کر رہے ہو۔ اُسے کرتے رہو۔"

اُس نے ایک لمبی سانس لی اور قلم اٹھایا۔ سیکشن آفیسر نے فائل آگے کھسکاتے ہوئے کہا۔ "سر سیکرٹری صاحب دو بار فون کر چکے ہیں۔ میں نے اُن کی مرضی کے مطابق نوٹ بنا دیا ہے۔"

اس نے سر ہلایا اور نوٹ کے نیچے دستخط کر دیئے۔ "ٹھیک ہے یہ فائل ابھی ان کے پاس بھیج دو۔"

پھر فوراً ہی اسے کوئی خیال آیا۔ "نہیں ٹھہرو، میں خود ہی لے جاتا ہوں۔ آج صبح سے انہیں سلام کرنے بھی نہیں جا سکا۔"

اُس نے آنسوؤں سے تر آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور بولا ——— "بس وہ ایک نفسِ مطمئنہ ہے نا، وہ نہیں"

مُرشد نے سر ہلایا ——— "رستے پر ڈولنے والوں کو نفسِ مطمئنہ نہیں ملتا۔"

اُس نے حیرت سے پوچھا ——— "رستے پر ڈولنے والے!"

"ہاں" مرشد مُسکرایا ——— "جب دنیاداری کا سلیقہ نہ ہو اور درویشی کا ظرف نہ ہو تو آدمی رستے پر ہی ڈولتا رہتا ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"بس کسی ایک طرف ہو جاؤ، درمیان میں لٹکتے رہے تو زندگی ایک عذاب بن جائے گی۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا ــــــــ "لیکن کسی ایک طرف ہو جانا بھی تو میرے بس میں نہیں، میں تو اس کشمکش میں کرچی کرچی ہو گیا ہوں۔"

مرشد کچھ نہیں بولا۔

"رستے کے ایک طرف کھلکھلاتی دنیا ہے اور دوسری طرف سرمئی دھند ــــــــ میں اس دھند میں اترنا چاہتا ہوں، لیکن رستے کا دوسرا سرا نہیں چھوڑتا، اور میں شاید اسے چھوڑنا چاہتا بھی نہیں، میرے بچے اپنے معصوم ہاتھوں سے مجھے گدگداتے ہیں، ان کی انگلیوں کا لمس ــــــــ لیکن دور کہیں وہ سرمئی سی دھند، اس کی تہہ میں اترنے والا راستہ کہاں جاتا ہے۔ وہ کون ہے؟ جو کبھی کبھی ایک جھلک دکھلا کر پکارتا ہے؟ میں اپنے نام کی پکار سنتا ہوں تو بے اختیار قدم ادھر اٹھنے لگتے ہیں، لیکن رستے کا توازن، ایک بے چینی، مجھے نفسِ مطمئنہ کب ملے گا؟"

مرشد مسکرایا ــــــــ "نفسِ مطمئنہ بھی بس ایک تصور ہی ہے۔ جو ہاتھ آتا ہے لیکن پھر بھی نہیں آتا۔"

ایک طرف کھلکھلاتی دنیا ہے، لذتیں اور محرومیاں، ساتھ ساتھ! بیوی کہتی ہے! ابھی تک مکان نہیں بن سکا، ملازمت میں ترقی نہیں ہوئی۔ بچے سکوٹر پر ریڑھے کی طرح لد کر سکول جانے کی بجائے اب کار میں جانا چاہتے ہیں، میں بھی سب کچھ چاہتا ہوں لیکن کر نہیں سکتا،

دفتروں میں رشوت دے کر خوشامد کر کے کام کروانا چاہتا ہوں لیکن طریقہ نہیں آتا، دفتر میں عام ساتھیوں سے لیکر سربراہ تک ہر ایک کو خوش کرنا چاہتا ہوں لیکن کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہو جاتی ہے۔

مُرشد اُس کا شانا تھپتھپاتا ہے ــــــــــــ "گڑبڑ باہر نہیں تمہارے اندر ہے، بس کسی ایک راستے کا انتخاب کر کے اسے قبول کر لو۔

ہر قدم پر ایک نہ ایک چیز، ایک نہ ایک رستے کا انتخاب! شاید مَیں نے زندگی کا انتخاب بھی اسی دو دلی سے کیا ہے، اسی لئے زندگی مجھ سے گریز پا ہے، اور دوسرے کنارے پر اُس سرمئی دُھند میں جو چھُپا بیٹھا ہے، اور جو کبھی کبھی مجھے پکارتا ہے کیا مَیں بھی اس کا اسی طرح کا گریز پا انتخاب ہوں، ان چاہا؛ زندگی ایک جبر ہے پیدا کرنے والے کے لئے بھی اور پیدا ہونے والے کیلئے بھی۔

اور یہ رستے کے درمیان رہ کر ڈولنے میں بھی ایک عجیب مزہ ہے، ایک ایسی لذّت جسے خود ہی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ گر پڑنے کا خوف، دونوں کناروں سے آتی آوازیں، ترغیبات اور اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوششیں؛ اور یہ درمیان؛ یہ بھی عجیب جگہ ہے، شاید ہر چیز کا ایک درمیان ہوتا ہے یا شاید نہیں ہوتا۔ یہ محض ایک فریب ہے، ایک ایسی کیفیت جو خود طاری کردہ ہے، یا واقعی کوئی درمیان ہوتا ہو جہاں سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے اور یہ درمیان، یہ جھولتا رستہ جہاں مَیں کھڑا ہوں ایک زندہ حقیقت ہے۔ اس کے دونوں کناروں کی دنیا مَیں مجھے اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں؛ کلکاریاں مارتے بچّے، لذّت بھری دنیا ــــــــــــ

اور دوسری طرف وہ سرمئی دُھند، جس کے پیچھے چھُپا وہ، جو روشنی کی طرح پھیلتا سکڑتا ہے ــــــــــــ اور درمیان مَیں ہُوں! سمجھ نہیں آتا کدھر جاؤں؟

ایک عجب مذبذب ہے۔

جانا تو مَیں دونوں طرف چاہتا ہوں، لیکن ایک طرف جانے کا سلیقہ نہیں دوسری طرف کا ظرف نہیں ــــــــــــ

زندگی بس ایک شرارہ ہے جو کہیں سے اڑتا ہوا آتا ہے اور زمین کو چھوتے ہی پلک جھپکنے میں شعلہ بن جاتا ہے ، رقص کرتا شعلہ جو جلاتا بھی ہے اور جنم بھی دیتا ہے۔

مُرشد کچھ نہیں بولا ، بس اسے دیکھے گیا۔

"یہ بے دلی ——— مجھے تو یوں لگتا ہے کہیں کسی جگہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو" مُرشد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ——— "مجھے یوں لگتا ہے ہماری اجتماعی موت واقع ہو چکی ہے۔"

"اجتماعی موت" اُس نے حیرت سے پوچھا ——— "تو پھر یہ ہمارے درمیان مکالمہ کیا ہے"؟

مُرشد لمحہ بھر چُپ رہا پھر بولا ——— "اجتماعی موت تو ہو چکی ہے لیکن ابھی تک کہیں کہیں انفرادی احساس باقی ہے ، اسی لئے تو اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے ، سمجھ نہیں آتا ، اصل کیا ہے اور عکس کیا ہے"؟

مُرشد کی بات سُن کر وہ دفعتہً چونک پڑا۔

"اصل اور عکس ، یہی کہا نا تم نے "

مُرشد نے سر ہلایا ——— "ہاں"

"بس مَیں سمجھ گیا ، ساری گڑبڑ یہ ہے کہ مَیں جو ہوں وہ نہیں ہوں بلکہ اپنی فوٹوسٹیٹ کاپی ہوں۔"

مُرشد سوچ میں پڑ گیا ، بہت دیر چُپ رہا پھر بولا ——— شاید یہی ہو ہم سب اصل کی فوٹو کاپیاں ہی ہوں ، یہ ہماری دُنیا بھی اصل کی فوٹو کاپی ہو ، لیکن جہاں اصل ہے کیا وہاں رستے پر کوئی نہیں ڈولتا ، وہاں نفسِ مطمئنہ کا کوئی مسئلہ نہیں۔"

دونوں چُپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے کہ اس سوال کا جواب، نہ مُرشد کے پاس تھا، نہ اس کے پاس!

سمندر جب اس کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ آنکھیں ملتا دروازہ کھولتا ہے تو دیکھتا ہے کہ مرشد سمندر کی لہروں پر تیرتا کلکاریاں مار رہا ہے، سمندر اسے دیکھ کر ایک نعرۂ مستانہ لگا کر جھپٹ پڑتا ہے۔ وہ سر سے پیر تک سمندر ہو جاتا ہے۔

مرشد کہتا ہے "چلے آؤ"۔

ایک لمحہ کے لئے مڑ کر دیکھتا ہے۔ گھر، گھر میں سوئے بیوی بچے، دنیاداری، فیصلے کا لمحہ طویل ہونے لگتا ہے لیکن مرشد آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور اسے اپنے ساتھ کھینچ لاتا ہے۔ سمندر دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پیچھے ہٹنے لگتا ہے اور دھیرے دھیرے اپنے کناروں میں لوٹ آتا ہے۔

حدِ نظر تک سرمئی دھند ہے جس میں وہ اور مرشد چلے جا رہے ہیں۔ مڑ کر دیکھنے کی خواہش لیکن کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

مرشد پوچھتا ہے ــــــ "کیا بات ہے کِسے ڈھونڈ رہے ہو؟"

وہ چند لمحے چُپ رہتا ہے پھر کہتا ہے ــــــ "صبح ہونے سے پہلے مجھے

گھر لوٹنا ہے۔"

مرشد ہنستا ہے ——— "گھر ایک جال ہے تم اس سے باہر نکل کر بھی دوبارہ اس میں پھنسنے کی تمنا کرتے ہو۔"

جال تو ہر جگہ ہیں، چھوٹے چھوٹے، بڑے بڑے، کلاس روم میں لڑکے اسے دیکھے جارہے ہیں۔ وہ حاضری کا رجسٹر ایک طرف کرکے کھنکارتا ہے۔ پھر کہتا ہے ——— یہ جو فضا ہے نا، یہ بھی ایک جال ہے، جس سے آگے ہم نہیں جاسکتے۔ یہ سائنس بھی چھوٹا سا جال ہے اور آدم کو آسمانوں کی وسعتوں سے نکال کر اس دنیا کے جال میں بند کر دیا گیا۔"

گھنٹی کی آواز سنتے ہی لڑکے اس کی بات اُدھوری چھوڑ کر باہر نکل جاتے ہیں، وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔

سانپ کو اکیلے ہی میں موقع مل گیا تھا۔

وہ ممنوع پھل کے ذائقہ کو بدن پر محسوس کرتا ہے۔

یہ ذائقہ ——— یہ ترغیب، لیکن وہ دونوں تو خود ہی ایک دوسرے کے لئے ترغیب تھے۔

پھر گناہ کیسا

اور اس ترغیب نے تو خود اس کے جسم سے جنم لیا ہے، یہ اس کی زندگی بھی ہے اور موت بھی،

وہ اس کے ہاتھ کو آہستگی سے سہلاتا ہے اور کہتا ہے۔ "چلو بھاگ چلیں۔"

وہ بڑی بڑی غلافی آنکھیں اُٹھا کر اسے دیکھتی ہے، منہ سے کچھ نہیں بولتی۔

مشکی گھوڑا انہیں لئے اُڑا جاتا ہے۔

وہ کہتی ہے ——— "ذرا آرام نہ کرلیں، وہ تو بہت پیچھے رہ گئے۔"

پھر وہی ترغیب
وہ لمحہ بھر کے لئے ہچکچاتا ہے ــــــ "منزل پر پہنچ جاتے تو۔"
وہ نیند بھری غلامی آنکھوں سے اس کے بدن کو گدگداتی ہے۔

ترغیب وہی ترغیب
گھوڑے کو درخت سے باندھتے ہوئے وہ ترکش کو احتیاط سے اپنے قریب رکھتا ہے۔
بھاگتے ٹاپوں کی آواز اُسے جھنجھوڑتی ہے تو وہ تیزی سے ترکش کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔

وہ کھلکھلاتی ہے۔
ہنہناتے مشکی گھوڑوں پر سوار وہ سارے اس کی کھلکھلاہٹ میں شریک ہوتے ہیں۔
وہی ترغیب وہی دھوکا
وہ چکرا کر سمندر کی بانہوں میں آگرتا ہے، مرشد کہتا ہے ــــــ "واپسی مبارک ہو۔"
"لیکن" ــــــ وہ بڑبڑاتا ہے ــــــ "میں نے دھوکا کیوں کھایا۔"
مرشد مسکراتا ہے ــــــ "دھوکہ آدمی اپنے آپ ہی سے کھاتا ہے اور وہ کچھ بھی نہیں، جو کچھ ہے وہ تم ہی تم ہو۔"
"تو کیا میں نے اپنے آپ کو ترغیب دی، گناہ کا راستہ دکھایا۔"
مرشد اور سمندر کچھ نہیں بولتے، بس ہنسے جاتے ہیں، وہ بھی ان کی ہنسی میں شامل ہو جاتا ہے۔ تینوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ لوٹ پوٹ ہوتے اس کی آنکھ کھُل جاتی ہے۔
وہ بے خبر سو رہی ہے اور اس کا ترغیب دیتا جسم آنکھیں مار رہا ہے۔

تو یہ میں ہی ہوں جو اپنے آپ کو گناہ پر اُکسا رہا ہوں۔

دفعتہً وہ جاگ پڑتی ہے ——— "کیا بات ہے، کیا دیکھ رہے ہو"

کچھ نہیں، کچھ نہیں، ——— وہ گڑبڑا جاتا ہے۔

وہ انگڑائی لے کر اُٹھتی ہے ——— ہاتھوں سے بال سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے کہتی ہے ——— "پریشان کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں" ——— وہ بڑبڑاتا ہے ——— "یہ تو میرا مقدر ہے کہ مجھے ترغیب دینے والا، میرا قاتل مجھ ہی میں سے پیدا ہوگا۔"

وہ کھڑکی کے پاس آتا ہے۔ سمندر اور مرشد دونوں کا کہیں پتہ نہیں، وہ کچھ دیر خلاء میں گھورتا رہتا ہے پھر مڑتے ہوئے کہتا ہے ——— "ہر شخص کا اپنا اپنا جہنم ہے۔ جس کا انتخاب وہ خود ہی کرتا ہے اور اس کی آگ کو تیز کرنے کے لئے وہ خود ہی اس میں ایندھن بھی ڈالتا رہتا ہے۔"

پھر خود سپردگی کے عالم میں آہستہ آہستہ اس کی غلافی آنکھوں اور کھلکھلاتے جسم کے بھنور میں ڈوبتا چلا جاتا ہے!

مُرشد نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور بولا ——— "اے خُدا میری واپسی کے سفر کو سانس لیتے منظروں سے ہمکنار کر۔"

اُس نے پوچھا ـــــــ "لوٹ کر کب آؤ گے"؟
مرشد مُسکرایا ـــــــ "تم زندہ رہنے کا سلیقہ جان گئے ہو اب میرے آنے کی کیا ضرورت ہے"؟
اس نے سر ہلایا ـــــــ "یہ تو ہے، لیکن پھر بھی کبھی کبھی یاد تو آؤ گے نا۔"
مرشد ہنسا ـــــــ "کیا معلوم میں کبھی یاد آؤں بھی کہ نہیں، دنیا میں بڑے رنگ ہیں اور آہنگ بھی اور کان ایک بار بند ہو جائیں تو آوازیں قید ہو جاتی ہیں۔"
اُس نے کہا "چھوڑو اس بات کو، آؤ آخری بار کیسنو میں چلتے ہیں۔"
"آج کل تم کافی مالدار ہو گئے ہو۔" مرشد نے سر ہلایا۔
"نہیں میرے پاس کچھ بھی نہیں بس زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"
"تھوڑی سی کوشش اور کریں تو ہم یہ مکان خرید سکتے ہیں"۔ بیوی نے چائے کی پیالی اس کے آگے کھسکاتے ہوئے کہا۔
"ہاں ابّو ـــــــ یہ گھر تو بہت اچھا ہے"۔ بیٹی نے تائید کی۔
"لیکن ـــــــ"
"لیکن کیا، جس جاب پر تم ہو وہاں ایسی باتوں کے لئے صرف اشارے کی ضرورت ہے۔"
"لیکن۔ مجھے یہ اشارہ کرنا ہی تو نہیں آتا۔"
مرشد ہنسا ـــــــ "میرا خیال ہے تم اب خاصے ٹرینڈ ہو چکے ہو، پھر ڈر کس کا۔"
وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا ـــــــ باہر سے کوئی ڈر نہیں بس یہ کم بخت اندر کوئی گڑبڑ ہے۔ جب بھی اشارہ کرنے لگتا ہوں تو اندر کوئی چیز تڑخ جاتی ہے۔"

مرشد سوچ میں پڑ گیا ــــــ "اس کا مطلب ہے ابھی تمہارے پھڑنے
کا عمل مکمل نہیں ہوا تمہاری بیوی نے کوشش تو بہت کی ہے"

"ہاں" اس نے سر ہلایا ــــــ "لیکن اس کی کوششوں سے کچھ نہیں ہوا،
مگر یہ بچے انہیں دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں، میرے سچ کی سزا یہ کیوں بھگتیں"

مرشد نے کچھ دیر تدبر کیا، پھر بولا ــــــ "نیکی کا عمل بہت لمبا ہوتا ہے
اور سچ نسل در نسل چلتا ہے"

"شاید اسی لئے مٹھاس کڑواہٹ میں بدل جاتی ہے"

مرشد نے اُسے گھورا ــــــ "تم ایک ایسے سرکش گھوڑے پر سوار ہو جس
کی باگیں تمہارے ہاتھ میں نہیں"

اس نے اثبات میں سر ہلایا ــــــ "جہاں رُکنا چاہتا ہوں، وہاں رُک نہیں
سکتا اور جہاں نہیں رُکنا چاہتا وہاں رُکنا پڑتا ہے ــــــ"

"بس یہی تمہارا المیہ ہے، تم لمحہ سے گریزاں ہو"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ لمحہ کی دہلیز پر نمودار ہوئی ــــــ "میں اب بھی تمہاری منتظر ہوں"

وہ دونوں بازو پھیلا کر اُس کی طرف بڑھا، لیکن عین اسی لمحہ مرشد نے اس کا
شانہ تھپتھپایا ــــــ "لو بھئی میں تو چلا"

اُس نے مرشد کا ہاتھ پکڑ لیا ــــــ "میں اس عذاب سے کب نکلوں گا،
میری واپسی کا حکم کب ہوگا۔؟"

مرشد مسکرایا ــــــ "واپسی ایک کیفیت ہے، ایک لذت آمیز کیفیت،
تم جب چاہو اس کا ذائقہ محسوس کر سکتے ہو"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا ــــــ "میرے منہ میں ایک بدمزہ

کسیلا لباب ہے۔"

پھر اس نے چائے کا لمبا گھونٹ بھرا ــــــ "یہ کڑواہٹ جاتے نہیں جاتی۔"

بیوی نے شکر دان آگے بڑھایا ــــــ "چینی تو ڈالی ہی نہیں کڑواہٹ کیسے جائے گی"

اس نے بے دلی سے شکر دان پکڑ لیا اور چینی گھولتے ہوئے بولا ــــــ "بچے کہاں ہیں۔"

"پڑوس میں گئے ہیں، گڈو کی سالگرہ ہے۔"

"اچھا" ــــــ وہ چونکا ــــــ "تو بچوں کو کوئی تحفہ لے دینا تھا۔ خالی ہاتھ گئے ہیں کیا؟"

"کیا لے کر جاتے۔"

"کمال کرتی ہو" وہ جھنجلا گیا ــــــ "تمہیں پتہ بھی ہے گڈو کے ابو اسٹیبلشمنٹ میں ہیں۔ دس کام ہوتے ہیں ان سے اور ابھی تو میری سنیارٹی کا معاملہ بھی پھنسا ہوا ہے۔"

مرشد ہنستے ہنستے دُہرا ہوگیا ــــــ "تم چلتے تو ٹھیک راستے پر ہو، لیکن درمیان میں سے جو اُچھلنے کی کوشش کرتے ہو تو سارا معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔"

اُس نے بے بسی سے کندھے ہلائے ــــــ "میں کیا کروں زندہ بھی رہنا چاہتا ہوں اور وہ منظر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مُرشد ایک دم سنجیدہ ہوگیا ــــــ "کسی ایک طرف ہو جاؤ، دو کشتیوں میں سوار ہوتے سے کہیں بھی نہیں پہنچ پاؤ گے۔"

وہ چُپ رہا۔

مرشد نے پوچھا ــــــ کیا سوچ رہے ہو؟

"کسی چیز کو پانا الگ بات ہے لیکن اس کی تمنا تو کی جا سکتی ہے ــــــ ہے نا"

"لیکن تمنا کرنے کا فائدہ کیا ــــــ؟"

"جی تو جلتے گا نا ــــــ اور اس آگ میں جلنا کتنا اچھا لگتا ہے ــــــ"

اور اس نے دیکھا دہکتے انگاروں کا ایک وسیع سمندر ہے جس پر وہ ننگے پاؤں چل رہا ہے ایک جلن ہے ایک مستقل کیفیت۔ جس میں ذائقہ بھی ہے اور کڑواہٹ بھی، اور اس جلتے سفر میں کہیں بچوں کی کلکاری، کہیں بیوی کی مسکراہٹ، کہیں کسی دوست کی پرخلوص حرکت ــــــ چھوٹی چھوٹی ٹھنڈکیں ہیں ــــــ مسلسل جلتے جانا اور درمیان میں کبھی کبھی ایک ننھی سی گدگداہٹ۔

اس نے آنکھیں بند کرکے ہاتھ اٹھائے ــــــ "میری رہائی کا حکم ہو" مرشد نے دونوں بازو پھیلا دیئے، کبوتر پھڑپھڑا کر اڑے اور ایک لمبا چکر لگا کر سامنے گنبد پر بیٹھ گئے، اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا ــــــ "سمندر میں اتر کر بھی دیکھ لیا، یہ لذتیں اور کڑواہٹیں وہاں بھی اسی طرح ہیں پس منظر ہی بدلتے ہیں"۔

اور اسے یوں لگا جیسے اس سے دو قدم کے فاصلے پر ٹھاٹھیں مارتا سمندر اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑا ہے۔
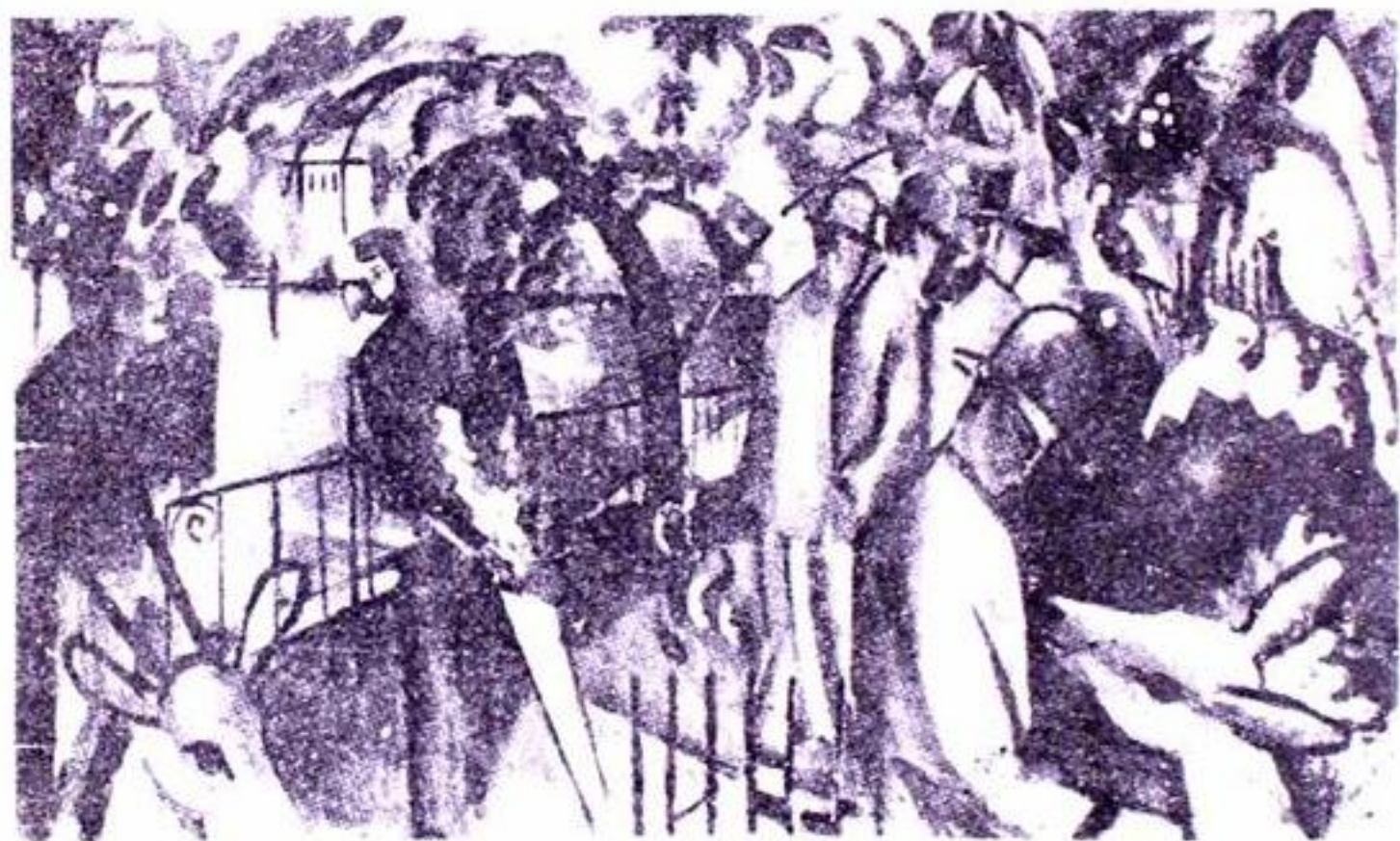
جاگنے کو ملا دیوے خواب کے ساتھ

اب یوں لگتا ہے ۔ جیسے سب کچھ اک خواب سا ہے، حال کو غائب سے ملانے کی فضول سی کوشش ، پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ساری باتیں بے جواز ہو جاتی ہیں ، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی گہری دھند میں سے گزر کر آتے ہیں ، جس میں کچھ دکھائی دیا ، کچھ نہیں دیا ۔ اپنا آپ بھی عجیب لگتا ہے ، میری ماں کہتی تھی کہ میری پیدائش سے چند ماہ پہلے اُس نے خواب دیکھا کہ وہ ایک دریا کے کنارے کھڑی ہے، دور سے ایک پھول بہتا ہوا آیا ۔ اس نے آگے بڑھ کر پھول اٹھا لیا ——— آنکھ کھلی تو اُس نے تعبیر نکالی کہ اس کے یہاں بیٹا ہو گا ، میرے وجود میں شائد خوشبو تو نہیں لیکن پھول کی طرح پتی پتی ہو جانا ضرور موجود ہے ، اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ خواب ہماری تمنائیں ہی نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات منظر نامے بھی ہوتے ہیں جو قبل از وقت ہمیں نظر آجاتے ہیں. غور کرتا ہوں تو سب کچھ خواب ہی محسوس ہوتا ہے ——— زندگی ، زندگی کی تگ و دو ، کسی دن اچانک آنکھ کھلے گی تو محسوس ہو گا کہ یہ سب کچھ تو واہمہ تھا ، ایک خواب ——— خواب در خواب

کوئی نہیں ہے اب ایسا جہان میں غالبؔ
کہ جاگنے کو ملا دیوے آکے خواب کے ساتھ

دنیا کے اندر بھی ایک دنیا چھپی ہوئی ہے جو ہر کسی کو دکھائی نہیں دیتی لیکن کیا ہر اسرار کا جاننا ضروری ہے، اگر ہم بہت سی چیزوں کو نہ بھی جانیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟

ایک شخص نے خواب دیکھا کہ وہ کسی اجنبی شہر میں جا پڑا ہے اور وہاں اس کا کوئی آشنا نہیں۔ نہ اُسے کوئی پہچانتا ہے اور نہ وہ کسی کو، سرگرداں پھرتا پھرا، پشیماں، غصہ اور افسوس کہ میں اس شہر میں کیوں آیا۔ یہاں نہ کوئی میرا آشنا نہ دوست، ہاتھ ملتے اور ہونٹ چباتے اُس نے تاسف کیا اور اسی تاسف میں آنکھ کھل گئی۔ دیکھا نہ شہر ہے نہ وادی۔ احساس ہوا کہ تاسف، غصہ اور پشیمانی سب بے فائدہ تھی۔ اپنی اس حالت پر وہ اور پشیماں ہوا، تاسف کیا، اسی تاسف میں آنکھ لگ گئی اور پھر خواب میں خود کو اسی شہر میں پایا۔ دوبارہ غصہ، غم اور افسوس شروع کر دیا کہ یہ کیسا شہر ہے جہاں نہ کوئی آشنا ہے نہ دوست۔ اسی تاسف میں آنکھ کھلی تو ——————

اب معلوم نہیں ہو پاتا کہ جاگنا کیا ہے اور خواب دیکھنا کیا؟

یہ چند لمحوں کے لئے غوطہ سا لگ جاتا ہے اور ہم کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو کسی اور دنیا میں پاتے ہیں تو لمحہ بھر کے لئے سارے رشتے، سارے حوالے اور سلسلے گڈمڈ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میں جو دریا پہ بہتا ایک پھول تھا اور جسے میری ماں نے اٹھا کر جھولی میں ڈال لیا تھا، کہاں سے بہتا ہوا آرہا تھا، کس ڈالی سے، کس زمین سے میرے سفر کا آغاز ہوا تھا اور یہ جو کبھی کبھی غوطہ لگا کر لمحہ بھر کے لئے میں کسی اور جہان میں پہنچ جاتا ہوں، یہ کیا زمانوں سے ماوراء کسی پر اسرار ماضی کی کشش ہے یا کہیں آگے نکل جانے کی خواہش، یا میرا یہ سفر تو ایک دائرے، ایک زمان کا پابند ہے۔ کہتے ہیں ہر شخص کی

جینز (GENES) میں ایک کلاک فٹ ہے جو اپنے وقت مقررہ پر ٹک سے بند ہو جائے گا، سفر کا خاتمہ، لیکن جی نہیں مانتا کہ یہ خاتمہ ہے ـــــــ ہو سکتا ہے یہ کسی نئے سفر کا آغاز ہو، جیسے رات کو ہم الارم لگا کر سوتے ہیں، یہ بھی دراصل الارم ہی ہے، ایک باب کا خاتمہ، دوسرے کا آغاز، اور ان دونوں کے درمیان ایک وقفہ، جس نے اسے جان لیا اس نے سارے اسرار سمجھ لئے، لیکن جان لینا اور جانے ہوئے کی لذت میں دوسروں کو شریک کرنا تو اور ہی بات ہے، اس کا تو مزہ ہی الگ ہے،

ایک بادشاہ نے کسی درویش سے کہا جب تجھ پر تجلی نازل ہو اور تو نور کے قریب ہو تو مجھے یاد کرنا۔ درویش نے جواب دیا، جب میں نور کے قریب پہنچتا ہوں اور اس آفتاب جمال کی تاب مجھ پر تجلی ڈالتی ہے تو میں خود بھی اپنے آپ کو یاد نہیں رہتا، تمہیں کیسے یاد کروں؟

لگتا ہے یہ ساری کائنات ایک وجود ہے جس کے اندر ہم جراثیموں کی طرح حرکت کر رہے ہیں اور اندر ہی اندر سے اسے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اس کائنات کے جینز (GENES) میں بھی ایک کلاک فٹ ہے جو اپنے وقت پر بند ہو جائے گا اور پھر ایک خاموشی ـــــــ لیکن کیا معلوم یہ ساری کائنات کسی اور بڑے وجود کے اندر پل رہی ہو اور وہ بڑا وجود کسی اس سے بھی بڑے وجود کے اندر ہو ـــــــ
ـــــــ اور ان سب کے جینز (GENES) کا اپنا اپنا کلاک ہو جو اپنے وقت پر بند ہوتا رہے گا،

ازل سے ابد تک ایک خواب، ایک پر اسرار سرمئی دھند جس میں کچھ دکھائی دیتا ہے کچھ نہیں، اور میں جو وجود اندر وجود ایک چھوٹا سا جرثومہ ہوں کائنات کی وسعتوں کو دریافت کرنے چلا ہوں، عظمت کی یہ تلاش انا کی تسکین کے سوا اور

کیا ہے ؟

"میں ، ہوں"

اگر ہوں بھی تو کیا ——————— نہیں ہوں تو کیا

چھوٹے لوگ کتنے اچھے ہیں کہ اپنے غموں اور خوشیوں کو چھپا نہیں سکتے اور فوراً شرکتیں چاہتے ہیں لیکن یہ بڑے لوگ اپنے اندر ہی سے باہر نہیں نکلتے ،

ایک درویش کسی شہر میں گیا۔ دیکھا کہ وہاں کا ہر شخص آئینہ کا اسیر ہے درویش نے تاسف کیا ، افسوس اس شہر کے رہنے والے اپنے چہرے کی حقیقت کو نہیں پہچانتے ———————

میرے اردگرد پھیلا ہوا یہ شہر آئینہ !

آئینہ کے اسیر ہو جائیں تو غیر کا تصور باقی نہیں رہتا۔ اپنا ہی آپ ہر طرف دکھائی دیتا ہے ۔

مجنوں نے ایک بار چاہا کہ لیلیٰ کو خط لکھے۔ قلم ہاتھ میں لیا ، لیکن محسوس ہوا کہ اس کا خیال آنکھ میں ، نام زبان پر اور یاد دل میں ہے ، پس جب ہر مقام پر وہی ہے تو خط کسے ——————— قلم توڑ دیا اور کاغذ پھاڑ دیا ،

زندگی کی اس رواروی میں اپنا سامنا کتنا مشکل ہے ، خوف آتا ہے ، دوسروں کا تماشا کرنے میں تو مزہ آنے لگتا ہے ، آدمی کیا ہوتا ہے کیا بن جاتا ہے ——— میں جو دریا میں بہتا پھول تھا جسے میری ماں نے اٹھا کر گود میں چھپا لیا تھا ، کیا کیا آدرش تھے میرے ، زمانے کو بدل دینے کے خواب لیکن وقت کی گرم استری نے سارے بل ، ساری سلوٹیں نکال کر کیسا سیدھا

ملائم کر دیا ہے، وہ انقلابی مکالمے، سسٹم کے خلاف نفرت کے جذبات، اور اب میں خود اسی کا ایک پرزہ ہوں، وہ سارے انقلابی ساتھی، مستقبل کو بدلنے کے خواب دیکھنے والے اس سسٹم میں کہیں نہ کہیں فٹ ہیں اور اسے معمول کے مطابق چلنے میں مدد دے رہے ہیں، کیا ہم سب اپنا رستہ بھول گئے ہیں؟

ایک قافلہ راستہ بھول کر، بھوکا پیاسا، بھٹکتے بھٹکتے ایک جنگل میں جا نکلا، وہاں ایک کنواں نظر آیا جس پر ڈول نہیں تھا۔ رسی اور ڈول لے کر قافلے والے کنوئیں پر آئے۔ ڈول کو کنوئیں میں لٹکایا، رسی کھینچی تو ڈول غائب۔ دوسرا ڈول لٹکایا، وہ بھی غائب۔ قافلہ کے ایک آدمی کو رسی باندھ کر کنوئیں میں لٹکایا۔ وہ اوپر نہ آیا، دوسرے کو لٹکایا، وہ بھی نہ آیا، تیسرا، چوتھا ـــــ قافلہ میں ایک سیانا تھا، اس نے کہا میں جاتا ہوں۔ انہوں نے اسے نیچے لٹکایا۔ وہ کنوئیں کی تہہ میں پہنچا تو ایک بلا دکھائی دی۔ سیانے نے سوچا اب چھٹکارہ نہیں، مقابلے کی بجائے میں کیوں نہ بے خود ہو جاؤں اور دیکھوں کہ مجھ پر کیا گزرتی ہے؟

بلا نے کہا ـــــ اے شخص اب تو میرا قیدی ہے، اگر میرے سوال کا صحیح جواب دے گا تو رہائی ملے گی ورنہ ساری عمر یہیں بسر ہو گی۔ سیانے نے کہا، پوچھو۔ بلا بولی ـــــ سب سے اچھی صورتِ حال کون سی ہوتی ہے۔ سیانے نے سوچا، میں قیدی اور مجبور ہوں، اگر کسی مثالی صورت کا ذکر کر بھی لوں تو کیا فائدہ۔ بولا ـــــ سب سے اچھی صورتِ حال وہ ہے جسے ذہنی طور پر قبول کر لیا جائے۔

چاہے وہ کسی بھی جگہ کسی بھی حالت میں کیوں نہ ہو۔

بلا بولی ــــــــ واہ تو نے کیا اچھی بات کی ہے ،چاتو رہا ہوا اور تیرے ساتھیوں کو بھی رہائی ملی ،

مجھے معلوم نہیں کہ اس رہائی کے بعد بھی قافلے والوں کو پانی ملا یا نہیں اور وہ جنگل سے نکل پائے کہ نہیں، لیکن ہم سے تو سوال کرنے والا بھی کوئی نہیں کہ ہم تو اپنی بلا بھی آپ ہی ہیں اور قیدی بھی آپ ہی ،
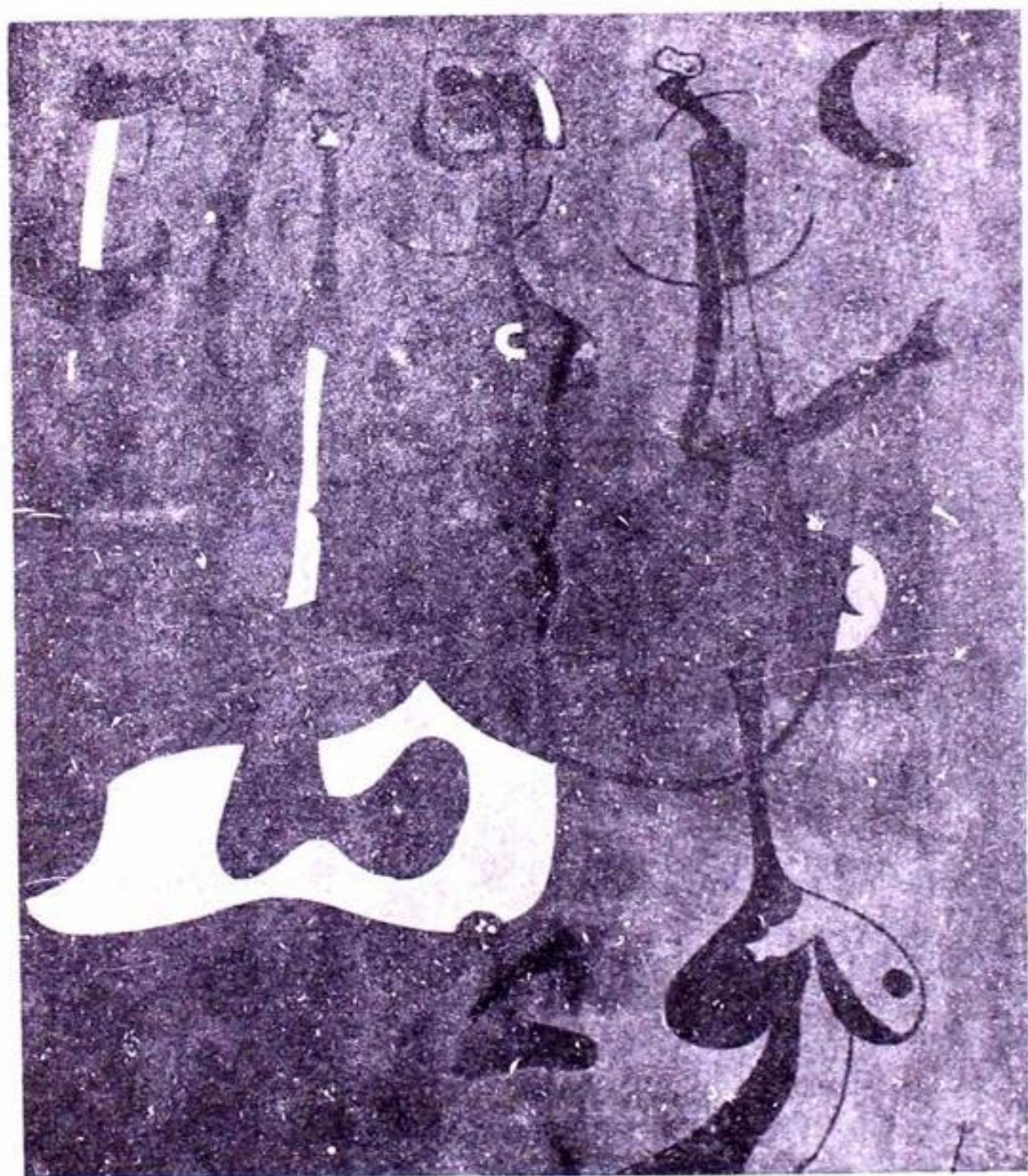
جنگل شہر ہوئے

برگد کا وہ پیڑ، جہاں اُس سے ملاقات ہوئی تھی، بہت پیچھے رہ گیا ہے، اور شناسائی کی لذت صدیوں کی دُھول میں اَٹ کر بدمزہ ذائقہ بن گئی ہے، ملاقات کی یاد ــــــــ بس ایک دھندلی سی یاد ہے، جب وہ اسے کریدنے کی کوشش کرتا ہے تو دُور کہیں ایک مدھم سی آواز سنائی دیتی ہے اور اس کے اندر بہت نیچے کوئی چیز لمحہ بھر کے لئے پھڑپھڑائی ہے، جدائی کا صدیوں پر پھیلا لمحہ ایک آن میں سمٹ آتا ہے، کھنکھتے گھنگھروؤں کی صدائیں اس کے سامنے رُک جاتی ہے، مترنم آواز کے ساگر میں کنکری گرتی ہے. گورے ہاتھوں میں پکڑے دُودھ کے پیالے سے زندگی بوند بوند اس کے حلق میں اترتی ہے۔ وہ سوکھی انتڑیوں میں پھیلی دانائی سے آنکھیں اُٹھا کر اسے دیکھتا ہے ــــــــ ایک نامعلوم خوشی کا جل بھری آنکھوں سے جھانکتی اور پھر آہستہ آہستہ مسکراہٹ بن کر پھیل جاتی ہے۔

شناسائی کی لذت ــــــــ

"دُکھ اندھیرا جال ہے جسے خواہش کی مکڑی دھیرے دھیرے بُنتی رہتی ہے. لیکن یہ دُکھ ہی تو دُنیا ہے۔"

اسی لمحہ میں تو وہ اس پرانی دنیا سے نکل کر نئے جہان میں داخل ہوا تھا ــــــــ لیکن

یہ تو برسوں پرانی بات ہے، اب نہ برگد ہے ــــــ، نہ دودھ کا پیالہ جس سے زندگی قطرہ قطرہ اس کی سوکھی انتڑیوں میں اتری تھی، ــــــ اب یہ سب دور کہیں ایک دھندلا سا عکس ہے جس سے آگے خلا ہے ــــــ نہ ختم ہونے والے فاصلوں کا سلسلہ!

وہ آنکھیں جھپکتا ہے ــــــ سٹیج کے پیچھے نہ ختم ہونے والے فاصلوں کا خلا ہے اور آگے تیز روشنیوں میں وہ دھندلے عکس کی طرح ــــــ تماشائیوں کی سیٹیوں، کراہوں اور لذت بھری آہوں کے درمیان زپ کھولتی ہے۔ زپ کے کناروں سے اس کے گورے بدن کا دریا اُچھل کر باہر آتا ہے۔

وہ گلاس اٹھا کر جلدی جلدی گھونٹ بھرتا ہے۔ بل کھاتا کڑوا ذائقہ رقص کرتا اس کی انتڑیوں میں اُترتا ہے۔

دودھ کا پہلا قطرہ شناسائی کی لذت، برگد کی گھنی شاخوں میں روشنی پھیل جاتی ہے ــــــ غلافی آنکھوں میں پھیلا کاجل سات رنگوں میں بدل جاتا ہے، دُور کہیں مور ناچتا ہے،

خواہش بھی تو ایک ست رنگا پرندہ ہے۔

جو دکھائی دیتا ہے وہ کیا ہے، جو نہیں دیتا وہ کیا ہے؟

تماشائیوں کی سسکاریاں اسے جھنجھوڑتی ہیں۔

اپنے بدن کو ہاتھوں کے پیالے میں سمیٹے وہ سٹیج کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک رقص کرتی ہے۔

سٹیج کے پیچھے ایک خلا ہے، آگے تماشائیوں کی لذت بھری سسکاریاں، ایک ہی لمحوں میں کئی جہانوں میں رہنے کی اذیت، پلک جھپکتا ہے تو ــــــ برگد کا پیڑ، سوکھی انتڑیوں پر لپٹی دانائی میں شناسائی کی لذت، جھکی آنکھوں میں کاجل مسکراتا ہے۔

دوسری پلک جھپکتا ہے تو ــــــ تماشائیوں کی لذت بھری سسکاریاں

تھرکتی ہیں، بدن ہاتھوں کے پیالے سے آزاد ہو جاتا ہے۔

کیا موجود ہے، کیا نا موجود؟

حقیقت کیا ہے، تصور کیا ہے؟

روح اور جسم کا رشتہ ـــــــــ جسم تو ہمیشہ نمائش چاہتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں ناپسندیدہ تاثر کروٹ لیتا ہے ـــــــ چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے وہ کہتی ہے ـــــــ "تمہاری ذہنی سطح بہت پست ہے، تم فن کو نمائش کہتے ہو"

"فن" وہ مردہ سی آواز میں دہراتا ہے۔

"میں نے یہ فن بڑی ریاضت سے سیکھا ہے" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتی ہے ـــــــ ـــــــ تماشائیوں کو ایسے لمحہ میں لے جانا جہاں چیزیں ساکت ہو جاتی ہیں، وقت رک جاتا ہے، زمان و مکاں کا تصور ہی بدل جاتا ہے، ایک جست، لمحہ بھر کی جست، جہاں بدن کی غلاظتیں پیچھے رہ جاتی ہیں ـــــــ میں دیکھنے والوں کو ایک لمحہ کے لئے سہی اس جہان سے نکال کر تصور کی اس دنیا میں لے جاتی ہوں جہاں پہنچنے کے لئے لوگ برسوں برگدوں کے نیچے بیٹھ کر اپنی انتڑیاں سکھاتے تھے اور تم ـــــــ تم کہتے ہو یہ نمائش ہے۔ وہ کھڑی ہو جاتی ہے ـــــــ "تم بہت چھوٹی سطح پر جی رہے ہو، تم تو اس لمحہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے"

وہ کھٹ کھٹ کرتی چلی جاتی ہے۔

وہ لمحہ ـــــــ کیا ہے اس کا تصور؟

برگد کا پیڑ کہاں چلا گیا ہے؟

جنگل اسے پکارتا ہے ـــــــ

توانائی کا ذائقہ ـــــــ دودھ کا پہلا قطرہ۔

اُس کی مردہ سوکھی انتڑیوں میں زندگی کی کونپل مُسکرا کر آنکھ کھولتی ہے۔

"جسم اور دنیا دونوں بے وفا ہیں اور سچ تو ایک جست کے فاصلہ پر ہے ——
—— ایک جست، جو جسم اور دنیا کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔"

دونوں ہاتھ جوڑے وہ اپنا سر اُٹھاتی ہے۔

"خواہش ایک ناگ ہے جو انسان کو مسلسل ڈستا رہتا ہے، پہلے پہلے آدمی چیختا ہے، پھر یہ نشہ بن جاتا ہے۔ ڈسوائے بغیر جینا مشکل ہو جاتا ہے، بس یہی سچ ہے۔"

وہ چُپ چاپ دونوں ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔

خاموشی ایک عبادت ہے۔

جنگل چُپ ہو جاتا ہے ——

ایک گہری چُپ، پھر دفعتہً اس چُپ میں ایک لذت بھری سسکاری گونجتی ہے۔ وہ گھبرا کر آنکھیں کھولتا ہے —— تماشائیوں کی سسکاریوں کا کا تناؤ ان کے چہروں پر منجمد ہو رہا ہے۔

اذیت یا پہچان ؟

وہ ایک ہی سانس میں سارا گلاس خالی کر دیتا ہے، کڑواہٹ ہونٹوں سے حلق کی گہرائیوں تک پھیلتی ہے۔

منہ کھولے تماشائی —— وہ اپنے فن کے آخری مرحلہ میں داخل ہو گئی ہے، کوئی اس کے وجود کو تیز آرے سے کاٹنے لگتا ہے۔

"مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا" وہ چیختا ہے —— "اذیت کیا ہے پہچان کیا ہے؟"

تماشائیوں کا سحر ٹوٹ جاتا ہے، وہ نفرت اور بے چینی سے اس کی طرف دیکھتے ہیں۔

شاید یہ اذیت ہی جاننا ہے کہ جانے بغیر دکھ اور سکھ کے لمحے جدا جدا نہیں رہتے۔

برگد کی چھاؤں میں کیسا سکون ہے؟

"لیکن یہ سکون زندگی نہیں، دکھی لوگ خوشی کے ایک ایک لفظ کے لئے ترس رہے ہیں"

وہ سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلی آتی ہے۔

"تو تمہارا خیال ہے میں سر جھکائے تمہارے پیچھے پیچھے چلوں گی" وہ قہقہہ لگاتی ہے۔

"تم خاصے بیوقوف ہو" ______

ایک لمحہ خاموش رہتی ہے، پھر وہ کہتی ہے ______ "میں اگلے ہفتہ یورپ کے

دورے پر جا رہی ہوں، چلو گے"

وہ کچھ نہیں کہتا، بس چپ چاپ اسے دیکھے جاتا ہے۔

"تم اپنی چھوٹی سی دنیا سے نکلنا نہیں چاہتے" وہ کھڑی ہو جاتی ہے ___

"مجھے پاسپورٹ آفس جانا ہے"

چھوٹی سی دنیا میں گم نام ہو جانے کا بھی تو اپنا ایک ذائقہ ہے۔

اور وہ جانا ______ وہ سفر وہ سب کیا ہوئے؟

یہ حقیقت ہے یا تصور؟

معلوم نہیں یہ موجود ہے یا ناموجود؟

اور برگد کا پیڑ تو بہت پیچھے رہ گیا ہے اور جاننے کے اُس لمحہ کے درمیان

کی بدمزہ دُھول پھیل گئی ہے۔

وہ یکے بعد دیگرے کئی گلاس خالی کر دیتا ہے۔

بیرہ اسے حیرت سے دیکھتا ہے ______ "صاحب اب بس کریں"۔

وہ بند ہوتی آنکھوں اور ڈوبتے حواسوں کے ساتھ سر اُٹھاتا ہے۔

جسم اور دنیا دونوں ہی بے وفا ہیں۔

پھر خود ہی ہنستا ہے لیکن آواز نہیں نکلتی، گلاس ہاتھ کی گرفت سے لڑھک

جاتا ہے۔

میرا جنگل مجھے بلاتا ہے۔

لیکن جنگل تو اب شہروں میں بدل گئے ہیں اور شہروں میں نہ برگد ہوتے ہیں، نہ گورے ہاتھوں میں دودھ کا پیالہ لئے کوئی انتظار کرتا ہے، شہروں میں تو سٹیج ہی سٹیج ہیں، اور یہ سٹیج بھی کئی ہفتوں سے ویران ہے کہ وہ یورپ جا چکی ہے۔

یہ تصور ہے یا حقیقت ؟

کیا موجود ہے اور کیا ناموجود ؟

سفر کشف ہے

جب کھدائی کا کام مکمل ہوا تو سورج دن کے زینے کی آخری سیڑھی اتر رہا تھا، وہ پچھلے کئی ہفتوں سے اس گمشدہ شہر کی کھدائی کر رہے تھے اور جوں جوں نیچے اترتے جاتے منظر کی حیرتیں انہیں اپنی اندر کھینچتی چلی جاتیں۔ اس دوران کئی بار پتھریلی زمین اور تیز دھوپ نے انہیں مایوسیوں کی آخری حدوں تک گھسیٹا لیکن وہ سر جھکائے اپنے کام میں لگے رہے اور اب جب وہ آخری سل ہٹا رہے تھے تو ان کی تھکی آنکھوں اور پتھرائے بازوؤں میں سوئی ہوئیں ساری تمنائیں بے رنگ سی ہو گئیں، سل کے نیچے زینہ تھا جس کی آخری سیڑھیاں نیم تاریکی میں گم ہوتی محسوس ہو رہی تھیں، ان میں سے ایک نے اس نیم تاریکی کو دیکھ کر کہا،

"میرا خیال ہے صبح کا انتظار کر لیا جائے"

لیکن ان میں سے جو ذرا کم عمر تھا اپنی بے تابی کو چھپا نہ سکا اور بولا۔

"راستہ کھل جائے تو پھر آنے والے کا انتظار کرتا ہے ہم نہ اترے تو ہم سے پہلے کوئی اور اندر چلا جائے گا"

باقی دو کوئی فیصلہ نہ کر پائے، پہلا جو سیڑھیوں کی تاریکی دیکھ کر کچھ مایوس

سا ہو گیا تھا،

قدرے ہچکچا کر بولا ـــــــــ "اب تو رات ہے اس تاریکی میں
کون آئے گا"۔

لیکن نوجوان نے اس سے اتفاق نہیں کیا ـــــــــ "اندھیرا ہی تو وہ چور دروازہ
ہے جس سے بے شناسی آتی ہے"

باقی دو اب بھی چپ رہے۔ پہلا تذبذب میں مبتلا ہو گیا ـــــــــ "میرا تو خیال تھا،
خیر جیسا سب کہیں"

نوجوان نے کندھے اچکائے اور سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔

نیم تاریکی میں سنبھل سنبھل کر زینہ زینہ اترتے وہ گمشدہ شہر کے منظروں میں گم ہو
جاتے ہیں۔

اس آرٹ گیلری میں تصویریں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتی ہیں
اور دیکھنے والے پتھر ہوئے جاتے ہیں،

پہلی تصویر میں ایک شخص تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چلا جا رہا ہے لیکن فاصلہ
ختم نہیں ہو رہا اور پیچھے آتے قدموں کی صدا تیز ہوئی جا رہی ہے وہ بار بار مڑ کر دیکھتا
ہے لیکن پیچھے کوئی نظر نہیں آتا، بس قدموں کی ایک صدا ہے کہ ساتھ ساتھ چلی آتی
ہے۔ وہ مڑ کر چیختا ہے

"کون ہے سامنے آؤ" لیکن نہ کوئی جواب آتا ہے نہ کوئی سامنے۔ وہ چلنا چاہتا
ہے لیکن خوف کی ٹھنڈک اس کے چہرے پر دھیرے دھیرے دستکیں دیتی ہے۔
وہ رک جاتا ہے اور آہستہ آہستہ صدا اور وہ، دونوں پتھر ہونے لگتے ہیں۔

دوسری تصویر بھرے بازار کی ہے

صبح ہو چکی ہے اور لوگ، دفتروں اور دکانوں پر جانے کے لئے گھروں سے

نکل آئے ہیں لیکن ہر ایک کو شبہ ہے کہ دوسرے کی آستین میں خنجر ہے۔ وہ ایک دوسرے سے دور دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سڑک پر آگے پیچھے چلتے ہوتے بار بار مڑ کر دوسرے کو دیکھتے ہیں رک جاتے ہیں تاکہ پیچھے والا آگے نکل جائے لیکن پیچھے والا آگے آنے کے لئے تیار نہیں اس آگے پیچھے کی کوشش میں ہر کوئی اپنی اپنی جگہ رکا کھڑا ہے۔

بس سٹاپوں پر لائن نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے کھڑے ہونے میں خوف محسوس کر رہے ہیں۔ ہر کوئی دوسرے سے فاصلے پر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ بسیں اور ویگنیں خالی جا رہی ہیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی بجائے سب پیدل چل رہے ہیں۔ بھاگ رہے ہیں۔ چلتے ہیں رک جاتے ہیں، رک جاتے ہیں پھر چل پڑتے ہیں۔

ہانپتے کانپتے دفتر میں پہنچتے ہیں تو سارے اپنی اپنی کرسیوں پر گرے ہانپ رہے ہیں لیکن ان کی آنکھیں چوکنی ہیں میزوں کی ترتیب بدل چکی ہے۔ کرسیوں کے رخ اس طرح ہیں کہ سارے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔ کام کے دوران بھی سب بار بار ایک دوسرے کو گھورتے ہیں اور اس افراتفری میں ایک فائل کے کاغذ دوسری میں اور دوسری کا نوٹ تیسری پر لکھا جا رہا ہے۔

رات نے اپنا دامن اس شہر سے سمیٹ لیا ہے۔

ایک پھیلا ہوا دن ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

گھروں میں کوئی دوسرے سے کھانے کی پلیٹ لینے کے لئے تیار نہیں کیا معلوم دوسرے نے اس میں زہر ——————؟

بیوی خاوند کو اور خاوند بیوی کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے۔

بیٹا باپ کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے اور باپ بیٹے کو۔؟

ریستورانوں میں ان کے سامنے رکھی چائے کی پیالیاں ٹھنڈی ہو چکی ہیں۔ کیا معلوم باورچی نے بابےے نے ——— ؟

کمروں میں داخل ہونے سے پہلے وہ ٹھٹھک جاتے ہیں اور دوسرے کے اندر جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ دوسرا پہلے کا اور اب وہ راہداریوں، گلیوں اور سڑکوں پر کھڑے ہیں کہ پہلے کون اندر جائے،

میزبان ڈرائنگ کے دروازے پر کھڑا کہہ رہا ——— "تشریف لائیے"

مہمان اپنی جگہ جما کھڑا ہے ——— "پہلے آپ چلئے"

بیوی خاوند سے کہتی ہے ——— کھانا لگ گیا ہے آجایئے"

خاوند کہتا ہے ——— "پہلے تم کھالو"

گھروں، دفتروں بازاروں میں وہ ایک دوسرے کو تاڑ رہے ہیں۔

فائلوں کے انبار لگ گئے ہیں۔ باورچی خانوں میں چولہے ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ میزوں پر رکھا کھانا جم گیا ہے۔ رات دن میں بدل گئی ہے ان کے بستر جسموں کی گرمی کے لئے ترس ترس گئے ہیں اور جسم ٹھٹھر ٹھٹھر کر پتھر ہو گئے ہیں۔

پتھر ہوتے ہوئے ان میں سے پہلے نے کہا ——— "شاید یہی ہمارا مقدر تھا"

درمیان والے دونوں چپ رہے، ان کی آنکھوں میں تیرتے آنسو ان کی گالوں پر بہہ نکلے، نوجوان نے تاسف سے سر ہلایا اور بولا ——— "ہمارے بعد شائد مدتوں بعد جب کوئی اس گمشدہ شہر کی کھدائی کرے گا تو وہ ہمیں بھی اسی کا ایک حصہ سمجھے گا، افسوس ہماری کوئی علیحدہ نشانی باقی نہیں رہی"

پہلے نے بمشکل سر ہلایا کہ پھیلتا پتھر اس کے کندھوں تک آن پہنچا تھا ———

"کون جانے ہمارے بعد کوئی ادھر آئے گا بھی ؟"

درمیان والے دونوں کچھ نہ بولے ان کی گالوں پر بہتے آنسو بھی تھم ہو چکے تھے ،

نوجوان نے کہ اس کی آنکھیں ہی متحرک تھیں ، آخری نظر تینوں کو دیکھا اور سنا کہ اوپر کہیں کدال چل رہی ہے ،

پتھر ہونے کے آخری لمحے میں اس نے سوچا ——— "کوئی آ ضرور رہا ہے لیکن کون جانے وہ بھی ہماری ہی طرح ——— یا شائد اس طلسم کو توڑ کر ہمیں بھی زندگی سے ہمکنار کر دے ، کون جانے ؟"

اوپر کھدائی کی آخری سل ہٹاتے ہوئے ایک نے کہا ——— "میرا خیال ہے صبح کا انتظار کر لیا جائے"

لیکن ان میں سے جو ذرا کم عمر تھا تیزی سے بولا ——— "راستہ کھل جائے تو کسی کا انتظار نہیں کرتا ہم نہ اترے تو ہم سے پہلے کوئی اور ———"
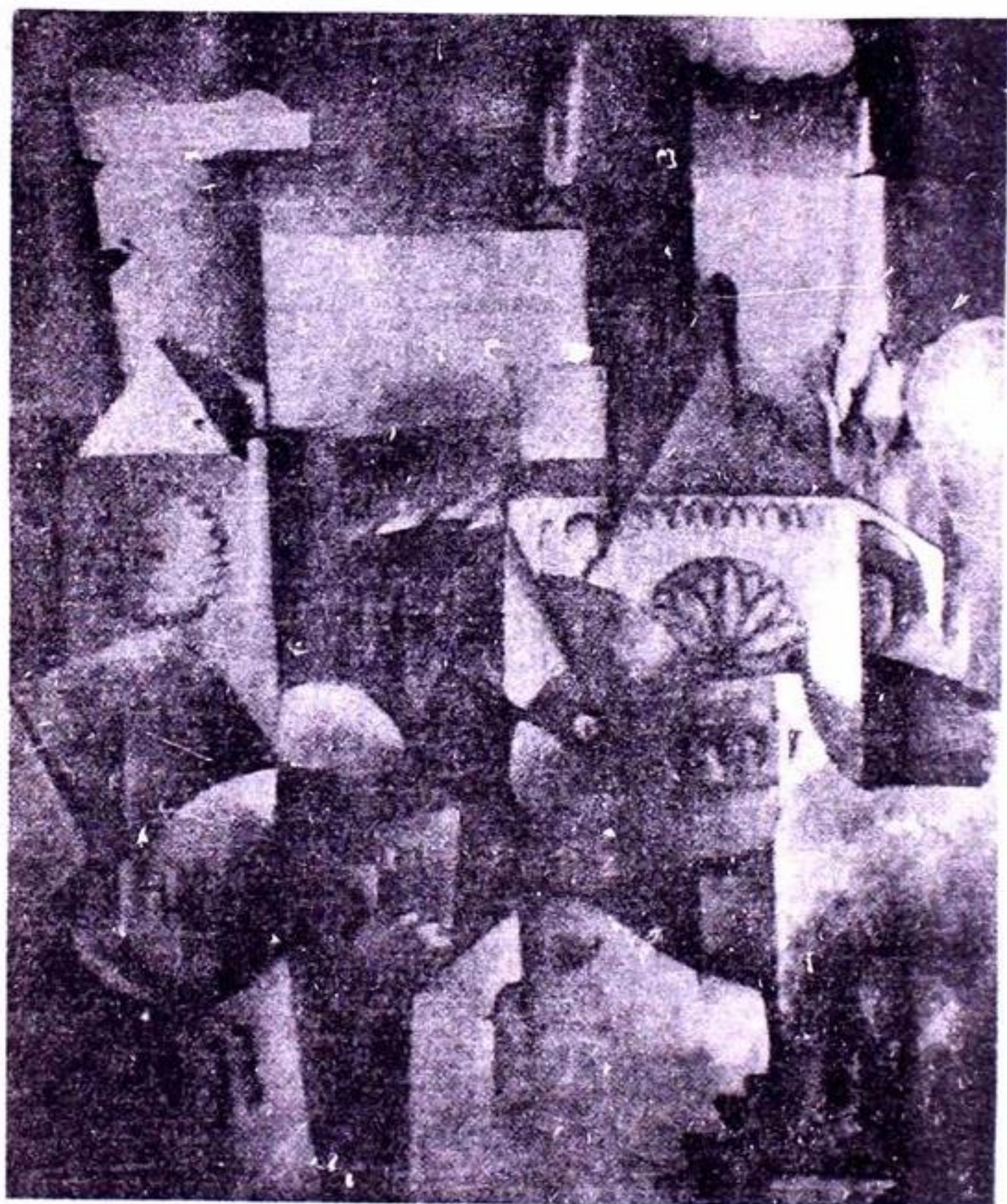
دریچے سے دُور

کبھی وہ زمانہ تھا کہ کہانی شفیق ماں کی طرح اسے لوریاں دیتی تھی۔ اس وقت وہ ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ دن بھر ہتھوڑوں کی آوازوں میں کرچ کرچ ہو کر جب شام کو گھر لوٹتا تو کہانی دبے پاؤں اس کے پیچھے آتی اور کسی سنسان سڑک پر اس کا ہاتھ تھام کر یوں اس کے ساتھ ساتھ چلتی جیسے کوئی محبوبہ ——— شام کو وہ اپنے جیسے کچھ دوستوں کے ساتھ درمیانے درجے کے ایک چائے خانے میں لفظوں کے چھوٹے چھوٹے غبارے بنا کر دن بھر کی تھکن کو ہوا میں اڑا دیتا۔ رات گئے گھر جاتے ہوئے کہانی اس کے ساتھ ساتھ چلتے اپنی سرمئی انگلیوں سے اس کے بدن کو سہلاتی۔ اس سہلانے میں ماں کی ممتا، اور محبوبہ کا لمس ایک ساتھ محسوس ہوتا۔ سونے سے پہلے نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ وہ کہانی کو دھیرے دھیرے کاغذ کی سیڑھیوں سے اترتا دیکھتا اور پھر جاگنے اور سونے کی درمیانی غنودگی میں کہانی اپنے رنگ برنگے آنچل کو اس کے پورے وجود پر پھیلا دیتی اور وہ نیند کے زینے سے اترتا کسی انجانی دنیا میں داخل ہو جاتا۔

اگلے دن پھر وہی معمول، صبح آنکھیں ملتے اٹھنا، جلدی جلدی چائے کے کپ میں

رس بھگو کر کھانا، سائیکل نکال کر دوڑتے ہوئے اس پر چڑھنا، اور ہوٹر کی آواز کے ساتھ ورکشاپ میں داخل ہو جانا۔ پھر وہی روزانہ کی مشق۔ ٹوکن لے کر حاضری لگوانا اور ڈیسک پر بیٹھ کر رجسٹر کھولنا ——— ان تمام موقعوں پر کہانی اس کے قریب ہی ہوتی اور ایک ہی اشارے پر لپک کر اس کے قریب آ جاتی۔ وہ بڑی بے نیازی سے اس کی انگلی پکڑتا کبھی جھٹک دیتا، لیکن کہانی سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی۔

دن کو جب اس کا افسر کسی معمولی سی بات پہ اسے جھاڑتا اور اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹنے سی لگتی تو کہانی لپک کر اس کے پاس آتی اور اپنی نرم سرمئی انگلیوں سے سہلاتی۔ چند ہی لمحوں میں اس کے اندر بھڑکتا شعلہ ٹھنڈا پڑ جاتا اور وہ سر جھکا کر رجسٹر پر اندراج کرنے لگتا، کہانی دھیرے دھیرے اپنا سنہری جالا اس کے گرد بنتی رہتی۔ شام کو گھر آتے ہی وہ اس جال کے ایک ایک تار کو کاغذ کے کھردرے جسم پر پھیلا دیتا۔ شام کو کینٹین میں گپ شپ کرتے وہ چہکتا تو ساتھی پوچھتے۔ "لگتا ہے آج کچھ ہاتھ آ گیا ہے"۔

وہ مسکراتا ——— "کہانی نے اپنے خزانے میرے لئے کھول دیئے ہیں"۔

رات گئے گھر لوٹتے، سنسان سڑک پر چلتے چلتے کہانی اچانک کسی دروازے، فٹ پاتھ یا کسی دکان کے تھڑے سے یوں ابھرتی جیسے دیہاتی دوشیزہ نہاتے ہوئے اچانک تالاب سے باہر آ جائے۔ وہ لمحہ بھر کے لئے ٹھٹھکتا اور پھر اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیتا ——— گھر آتے ہی بغیر کھانا کھائے وہ کاغذوں پر جھک جاتا۔

ماں کہتی ——— "پہلے کھانا تو کھالو"۔

کہانی اس کے وجود پر اس طرح پھیلی ہوتی کہ اسے جواب دینے کی بھی فرصت نہ ملتی، بس سر ہلا کر رہ جاتا ———

ماں کھانا رکھ جاتی، لیکن وہ سر نہ اٹھاتا۔

بہت دیر بعد جب وہ کاغذ کے آخری سرے پر اپنے دستخط کرتا تو کھانا جم چکا ہوتا۔ وہ بے زاری سے سر ہلاتا تو کہانی کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ ہنسی کی پھوار میں ٹھنڈا کھانا بھی اسے کسی بڑی دعوت کی طرح محسوس ہوتا۔

یہ وہ دن تھے جب اس کی خواہشیں قدم قدم پر دم توڑتی تھیں۔ چیزیں اور لوگ آنکھیں مارتے اس کے پاس سے گزر جاتے تھے لیکن وہ نہ کسی چیز کو لے سکتا تھا نہ چھو سکتا۔ بس دیکھتے رہنا ہی اس کا مقدر تھا ——— جوان بہنوں کے بوجھ اور بیوہ ماں کی انتظار کرتی کھلی آنکھوں نے اس کے کندھوں کو جھکا دیا تھا۔ وہ کسی کو اپنا دکھ نہیں بتا سکتا تھا۔ بس ایک کہانی تھی جو دکھ کے ان لمحوں میں اس کی رفیق تھی۔ اس کی رفاقت میں اسے ماں کی ٹھنڈک محسوس ہوتی۔ کبھی کبھی جب کسی رنگین آنچل کو دیکھ کر اس کے اندر ایک لاوا سا پھیلتا تو کہانی اپنی نرم ٹھنڈی چھاؤں سے شانت کر دیتی، وہ اس سے مکالمہ کرتا

"میری کائنات یہی ہے ——— یہی بے بسی!"

کہانی مسکراتی ——— "نہیں ——— سبھی راستے کھلے ہیں۔"

وہ مایوسی سے سر ہلاتا ——— "لیکن میرے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ سارے راستے دوسروں کے لئے ہیں۔"

کہانی کہتی ——— "راستے متعصب نہیں ہوتے۔ ان کی بانہیں سب کے لئے کھلی ہوتی ہیں۔ بس کوئی آنا بھی چاہیئے۔"

"لیکن کیسے آئے ——— کوئی کیسے آئے" وہ چیختا۔ کہانی آہستگی سے اس کا کندھا سہلاتی ——— "اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔"

کہانی کے اسی حوصلے نے اسے ہمت دلائی اور وہ کسی کو بتائے بغیر مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گیا۔ دھندلاہٹوں، مایوسیوں، امیدوں اور طرح طرح کے خوابوں کے

درمیان اس نے امتحان دیا۔ انٹرویو میں گیا اور ایک دن اچانک غیر متوقع طور پر اسے کامیابی کی اطلاع ملی۔

اس شام وہ اور کہانی خوب کھلکھلا کر ہنسے اور دیر تک ہنستے رہے۔ وہ دونوں کئی صفحوں پر لوٹ پوٹ ہوئے۔ نئی ملازمت کے پہلے دن دفتر جاتے ہوئے اس نے کہانی سے کہا ——— "میرا تمہارا ساتھ انمٹ ہے۔"

کہانی مسکرائی ———

زندگی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ نئی ملازمت میں تنخواہ کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ چند ہی سالوں میں ماں کی انتظار کرتی تھکی آنکھوں میں نئی چمک آگئی۔ بہنیں بیاہ کر اپنے گھر چلی گئیں۔ ماں شادی کے لئے کہتی تو وہ انکار میں سر ہلا دیتا اور چپکے سے کہانی سے کہتا "میرے لئے تو سب کچھ تم ہی ہو۔"

لیکن ماں نے اس کی شادی کر دی۔ بیوی اچھی پڑھی لکھی عورت تھی۔ اس کے ساتھ کہانی کا بھی احترام کرتی تھی۔ اسے جو ڈر تھا کہ کہانی اور بیوی ایک ساتھ کیسے رہیں گے، تو ایسا کچھ نہ ہوا ——— اس نے اطمینان کا سانس لیا ——— کہانی اب بھی اس کے ساتھ تھی اور بیوی سے محبت کرنے کے باوجود بہت سے جذبے اور باتیں اب بھی ایسی تھیں جنھیں وہ صرف کہانی ہی سے کہہ سکتا تھا۔ دونوں اب بھی ایک دوسرے کے راز دار تھے۔

یہ راز داری ——— سرگوشیاں وقت کے تھال پر دنوں، مہینوں کی گرد جمتی رہی۔ دو بچے ہو گئے اس دوران بہت کچھ بدل گیا۔ اس نے محلہ میں پرانا آبائی مکان بیچ کر ایک نئے علاقہ میں شاندار کوٹھی بنوائی ملازمت میں ترقی اور نئے گھر میں آنے کے بعد مصروفیات بڑھ گئیں، کہانی سے ملاقات میں وقفہ ہونے لگا ——— لیکن ان کی سرگوشیاں اور ایک دوسرے میں شرکت قائم رہی۔

کیفے میں جانا ایک عرصہ سے موقوف ہو گیا تھا ـــــــ اب لوگ خود اس سے ملنے آتے تھے، کہانی کا بھی ذکر ہوتا۔ لیکن آہستہ آہستہ کہانی اس کے وجود سے کھسکنے سی لگی۔ اب اسے کاغذ پر پھیلاتے، اس کے سرمئی لمس کو محسوس کرتے اسے تھوڑی سی دقت ہوتی۔ وہ دیر تک قلم منہ میں دبائے اس کا انتظار کرتا، بڑی مشکلوں سے وہ چند لموں کے لئے اس کے پاس آتی اور پھر بہت لمبے عرصے کے لیے کہیں گم ہو جاتی۔

شروع شروع میں اسے کہانی کی اس بے رخی سے صدمہ سا ہوا۔ لیکن بچوں کی کلکاریوں، دفتر کے ہنگاموں اور زندگی کی پر تعیش و بازتوں نے اسے اپنے اندر سمیٹ لیا۔ مگر کبھی کبھی جب وہ تنہا ہوتا تو کہانی سے اپنی لمبی رفاقت کا خیال آتا۔

وہ اپنے آپ سے پوچھتا ـــــــ "مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟" پھر خود ہی جواب دیتا ـــــــ "چیزوں سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا ہے، وہ سنسان سڑکیں، لمبی گلیاں، اور ادھ کھلے دروازے، ورکشاپ، کے ہتھوڑوں کی شور شیں، ابھرتی ڈوبتی سسکیاں، کیفے کی گرم گرم بحثیں اب میرے راستے کا حصہ نہیں رہیں ـــــــ اور خود ہی تائید میں سر ہلاتا ـــــــ "عرصہ ہوا میں نے کوئی کتاب کھول کر بھی نہیں دیکھی۔"

اس پر ایک اداسی چھا جاتی، اور کسی کو بتائے بغیر وہ کسی طرف نکل جاتا۔ ایسی حالت میں کبھی کبھی کسی ویرانے میں یا کسی رونق میں اسے کہانی نظر آجاتی۔ وہ لپک کر اس کے قریب پہنچتا۔ لیکن وہ کنی کترا کر نکلنے کی کوشش کرتی بڑے تعاقب، بڑی جستجو کے بعد کہیں ہاتھ آتی ـــــــ لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا، ورنہ عموماً اسے خالی ہاتھ ہی لوٹنا پڑتا ـــــــ

پھر زندگی کے ہنگامے اور پھیل گئے۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے اس نے سوچ لیا ـــــــ اگر کہانی میرے پاس نہیں تو کیا ہوا، میری عزت میں

تو اور اضافہ ہو گیا ہے۔ پہلے لوگ اسے کہانی کی وجہ سے بلاتے تھے۔ اب اس کے عہدے کی وجہ سے بلانے لگے تھے۔ کسی نے بھول کر بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس کی دیرینہ رفیق کہانی اسے کیوں چھوڑ گئی ہے ــــــــ بس اسی خیال نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ پوچھتے کیوں نہیں، کہانی نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اس کا رویہ میرے ساتھ ایسا روکھا کیوں ہو گیا ہے۔ اب تو کہیں سر راہے مل بھی جائے تو یوں آنکھیں پھیر لیتی ہے جیسے کبھی شناسائی ہی نہ تھی۔ اس کی ماممتا شفقت اور محبوبیت کہاں چلی گئی؟ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے ــــــــ "یہ کیا ہے کہ جب چیزیں اور منظر باہر سے ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں تو ــــــــ اندر ایک چیز سلامت ہوتی ہے، لیکن جب باہر کے منظر اور چیزیں جڑ جاتی ہیں تو اندر کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے۔"

وہ مجھ سے بھی پوچھتا ہے ــــــــ "کہانی مجھ سے کیوں روٹھ گئی ہے ـــ؟"

لیکن میرا تو اپنا آپ مجھ سے روٹھ گیا ہے میں اسے کیا جواب دوں؟ ـــ

تمنّا کا دوسرا قدم

صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو کھلی کھڑکی سے منظر اسی طرح اونگھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سیمنٹ کی بوسیدہ دیوار پہ جھکا ہوا درخت، جس کی بوڑھی شاخیں بند دریچے کو چھو رہی ہیں۔ یہ دریچہ ہمیشہ بند رہتا ہے، جانے کب سے اسی طرح بند ہے۔

وہ روزانہ دیر تک بستر پہ لیٹا اسے دیکھتا رہتا ہے۔ شیو کرتے، دانت مانجھتے، منہ دھوتے اس کی نظریں بار بار اُدھر جاتی ہیں لیکن دریچے میں کوئی رنگ دکھائی نہیں دیتا۔ دن بھر دفتر کے شور، فائلوں کی پلک جھپک میں دریچہ ذہن کے کسی قدرتی گوشے میں چھپا رہتا ہے۔ لیکن شام ہوتے ہی جب وہ اپنے کمرے میں آکر کھڑکی کھولتا ہے تو دریچہ مسکرا کر آنکھ مارتا ہے۔ اس آنکھ مارنے اور مسکرانے میں ایک عجیب محبوبانہ شکایت اور لگاؤ ہے کہ وہ بغیر پوچھے اپنے دن بھر کی ساری مصروفیات کی ایک ایک تفصیل سُنانے لگتا ہے اور پھر دفعتاً جب اُسے احساس ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی بولتا چلا جا رہا ہے تو کھسیانا سا ہو کر آرام کرسی میں دراز ہو جاتا ہے۔ نرم ریشمی اندھیرا آہستہ آہستہ چاروں طرف پھیلنے لگتا ہے۔ مدھم موسیقی کی سُروں میں دریچہ آہستہ آہستہ کھسکتا اس کی کھڑکی کے قریب آجاتا ہے۔ وہ لپک کر اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے احساس ہوتا ہے

کہ ان کے درمیان توریت کا ایک جلتا سمندر حائل ہے۔ وہ اس جلتے سمندر کے دونوں کناروں پر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ لیکن کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اس جلتے سمندر میں اتر پڑے۔ دھیرے دھیرے پھیلتا اندھیرا انہیں اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھا بیٹھا پتھر ہوتا جاتا ہے۔

بہت دیر بعد جب اس کا ملازم کھانے کے لئے بلاتا ہے تو وہ آہستگی سے اُٹھ کر کھڑکی کے قریب آتا ہے اور اندھیرے میں گھور گھور کر بند دریچے کو دیکھتا ہے۔ کھانا کھانے، کچھ دیر پڑھنے اور پھر سونے کے درمیانی وقفوں میں بار بار اس کی نظریں دریچے کے بند کواڑوں سے ٹکراتی ہیں اور اس وقت تک جب نیند اپنی سرمئی ٹھنڈی انگلیوں سے اس کے پپوٹوں کو سہلا رہی ہوتی ہے، دریچہ اس کی آنکھوں کی گیلری میں جھلملاتا رہتا ہے۔

گہری نیند میں اسے اپنے نام کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بوجھل آنکھوں سے وہ کھلے دریچے میں اسے کھڑا دیکھتا ہے، دونوں ہاتھ پھیلائے وہ اسے اپنی طرف بلاتی ہے۔ کھڑکی سے نکل کر ہوا میں چلتا وہ اس کے ساتھ دریچے میں داخل ہوتا ہے۔
سبز لہلاتے کھیتوں میں بانسری کی آواز ٹھنڈی پھوار کی طرح اس کے جسم کو سہلاتی ہے۔
وہ کہتا ہے۔"تم چلی جاتی ہو تو وقت رک جاتا ہے"۔
وہ ہنستی ہے ——— "وقت تو کسی کے لئے نہیں رُکتا۔ بس ہم ہی کہیں ستانے لگتے ہیں"۔

وہ سر ہلاتا ہے ——— "شاید ستانے کے یہ چند لمحے ہی زندگی کی خوشبو ہیں"۔

"اور خوشبو اجنبیت کو تعلق میں بدل دیتی ہے"۔ پھر وہ اچانک اُداس ہو جاتی ہے ——— "فاصلہ تعلق کو دیمک کی طرح کھا جاتا ہے"۔

وہ چند لمحے چپ رہتا ہے، پھر کہتا ہے۔ ''مجبوریاں ہم پر حکومت کرتی ہیں اور بے بس ہونا بھی کتنا بڑا دکھ ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولتی۔

وہ کہتا ہے ——— ''ہم میں سے ہر ایک، ایک دائرے میں بند ہے اور دائرے کی حدوں تک ہی آگے پیچھے جا سکتا ہے، شاید یہی مقدر ہے۔''

وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتی ہے ——— ''اپنے اپنے دائروں میں ہم جہاں تک ایک دوسرے کے قریب آ سکتے تھے آ گئے ہیں۔ اور اب پیچھے ہٹنا ہمارا مقدر ہے ——— تو کب جا رہے ہو؟''

''شاید پرسوں۔''

''شاید کیوں؟''

شاید اس لئے کہ پرسوں صبح میں چلا جاؤں گا اور کوئی یہیں رہ جائے گا یا شاید کوئی چلا جائے گا اور میں یہیں ——— اس کی سرمئی آنکھوں میں بادل تیرتے ہیں۔

''میں روز رات کو دیا جلاؤں گی اس دریچے کے سامنے اور تم جہاں کہیں بھی ہو گے میری آواز سنو گے۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے ——— ''میں جہاں بھی ہوں گا، وہاں صرف میرا جسم ہو گا۔ لیکن میں ——— میں ہمیشہ اس دریچے کے پاس، اس جلتے دیئے کے سامنے ———''

اس کی آواز ہچکیوں میں ڈوب جاتی ہے۔ پھر ہچکیاں پھیلتے پھیلتے چیخوں میں میں بدلنے لگتی ہیں۔

ملازم دوڑتا ہوا آتا ہے اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھتا ہے۔

"کیابات ہے صاب ـــــ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

وہ گم سم آنکھیں پھیلائے اُسے دیکھتا رہتا ہے۔

ملازم دوڑ کر میز کی دراز کھولتا ہے اور شیشی میں سے دو گولیاں نکال، جگ میں سے پانی انڈیلتے ہوئے اس کی طرف بڑھاتا ہے ـــــ "لیجئے، ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ اب جب بھی دورہ پڑے یہ گولیاں لے لیجئے۔"

وہ بغیر کچھ کہے گولیاں کھا لیتا ہے۔

صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو کھلی کھڑکی سے منظر اسی طرح اونگھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سیمنٹ کی بوسیدہ دیوار پر جھکا ہوا درخت جس کی بوڑھی شاخیں بند دریچے کو چھو رہی ہیں۔

یہ دریچہ کب کھلے گا؟

شام کی دہلیز پر آخری مکالمہ

شام نے ابھی اپنی سرمئی پلکیں اٹھائی ہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ ہانپتا ہوا اندر آیا اور بولا ——— "سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔"

میں نے پوچھا ——— "کیا ہوا؟"

چند لمحے چُپ رہا پھر کہنے لگا ——— "میں زندہ نہیں ہوں"۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے تم نے کئی دن پہلے اپنے مرنے کا اعلان کیا تھا۔"

اس نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا ——— "میرا مذاق تو نہیں اُڑا رہے ہو؟"

"نہیں" میں نے سنجیدگی سے کہا ——— "مجھے تمہاری بات کا پورا یقین ہے"

اس نے اطمینان سے سر ہلایا اور ٹانگیں پسار کر کرسی سے ٹیک لگا لی"

کبھی آدمی مر کر بھی نہیں مرتا اور کبھی کبھی مرنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے، چنانچہ جب کچھ دن پہلے اُس نے مرنے کا اعلان کیا تو مجھے زیادہ حیرت نہ ہوئی، لیکن دوسروں کا رویہ بڑا مختلف تھا۔ انہوں نے پہلے تو مذاق اڑایا مگر جب وہ اپنی موت پر اصرار کرتا رہا تو اسے پاگل سمجھنا شروع کر دیا۔

اس کا چھوٹا بھائی کہنے لگا ——— "مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا کہ ایک دن

یہی ہوگا، پچھلے کئی ہفتوں سے اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں"۔
بیوی نے بھی اثبات میں سر ہلایا ——— "مجھے بھی اب لگتا ہے کہ پچھلے کئی دنوں سے ان کا رویہ عجیب سا تھا"۔
مجھے معلوم نہیں کہ اُس کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب ہے یا نہیں لیکن وہ یہ اصرار ضرور کئے جا رہا ہے کہ اب میرا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
اب وہ ایک "مشین" ہے جس کا ہر عمل معمول کے مطابق ہے، مخصوص وقت پر اٹھنا، تیار ہو کر دفتر جانا ——— دفتر میں بھی معمول کا ایک عمل، شام کو وقت پر واپسی،
دفتر میں ہمارے ساتھی چند دن تو بہت پریشان رہے کہ اس جیسے ہنس مکھ اور خوش اخلاق شخص کو ——— یہ کیا ہو گیا ہے ——— آگے بڑھ بڑھ کر ملنے والے کو یہ کونسی گہری چپ لگ گئی ہے ——— خاموشی سے آنا اور سارا دن فائلوں میں ڈوبے رہنا،
ایک دن یونہی میں نے پوچھا
"زندگی کے دنوں اور ان دنوں میں کیا فرق ہے؟"
اس نے خالی نظروں سے مجھے دیکھا ——— "شور اور خاموشی میں بڑا وقفہ ہوتا ہے"۔
چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا ——— "زندگی تو پانی پر تیرتا ہوا پھول ہے اور موت بھیگ کر ڈوب جانا"
میں نے کہا ——— "شائد تم ٹھیک ہی کہتے ہو، جب معمول کا بوجھ ہماری ہمت سے زیادہ ہو جاتا ہے تو ہم پانی کی تہہ میں اترنے لگتے ہیں، لیکن ایک بات بتاؤ"

اس نے سر اٹھایا،

"رشتے اور جذبے تو بڑے طاقت ور ہوتے ہیں، کسی بچے کی کلکاری بھی تمہیں سطح پر نہیں لاتی۔"

اس کی آنکھیں لمحہ بھر کے لئے چمکیں ——— "یہ جو سب سے چھوٹا لڑکا ہے نا ——— سومی، جب وہ اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے میرے گال تھپتھپاتا ہے تو لگتا ہے میں پھر اکٹھا ہونے لگا ہوں۔"

"تو اکٹھے ہو کیوں نہیں جاتے، کہیں تمہیں بکھرنے میں مزہ تو نہیں آنے لگا؟"

"اکٹھا ہونا اور پھر بکھر جانا ——— بکھر کر دوبارہ اکٹھے ہونا۔ مجھے معلوم نہیں اذیت کہاں ہے اور لذت کہاں ———؟ بس یہ کوئی ایک لمحہ ہے جسے ہم زندگی بھر تلاش کرتے رہتے ہیں۔"

"ایک لمحہ"

"ہاں صرف ایک ہی لمحہ، کبھی مل جاتا ہے اور کبھی پوری زندگی گزار کر بھی ہاتھ نہیں آتا"

اور اس کے باہر پانی کی ایک منہ زور لہر ہے ——— اچھلتی ناچتی منہ زور لہر، جو آہستہ آہستہ سب کو کھینچ کر تہہ میں لے جاتی ہے۔

یہ سارا منظر خواب اور جاگنے کے درمیان کا ہے

خواب کے لمحوں اور جاگنے کے لمحوں کے درمیان ایک وقفہ ہے ——— جہاں سے کبھی ہم پلک جھپکنے میں گزر جاتے ہیں اور کبھی ہمیشہ کے لئے وہیں رہ جاتے ہیں!

(۲)

میں ——— شاید میں نہیں ہوں

مجھے اپنے ہونے میں بھی شبہ ہے اور نہ ہونے کی بھی کوئی تصدیق نہیں

اپنے ہونے کا احساس تو خوشبو کی طرح ہے جسے کلی کی طرح ہم اپنے اندر

چھپائے پھرتے ہیں۔

لیکن جونہی کلی کھلتی ہے یہ خوشبو ہماری نہیں رہتی ،

اب یاد نہیں وہ کونسا لمحہ تھا جب آوازوں نے اپنی پہچان بدلی تھی اور رشتے بے آواز ہوئے تھے ، یونہی ہوتا ہے کبھی چیزیں بدل جاتی ہیں اور کبھی ہم خود بدل جاتے ہیں زندگی ایک ایسے تختہ سیاہ کی طرح بن جاتی ہے جس پر کچے حروف میں زندگی کے معنی لکھ دئے جاتے ہیں ——— ایک ایسی تحریر جس کے مفہوم سے ہم آشنا نہیں ہوتے لیکن ان کے مطابق زندگی کرنے کی پابندی ہوتی ہے ،

میرے رشتے ، میرے جذبے ، میری شرکتیں ، سب اجنبی ہیں ، شاید کبھی میری ان سے آشنائی رہی ہو ، لیکن اب میرے لئے ان کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

یہ بکھرے بالوں والا میرا چھوٹا بھائی ، اس کے لئے زندگی کتنی آسان ہے ، نہ کچھ کرنا بس کتابیں اٹھا کر کالج جانا اور سارا دن پگیں لگانا ——— میرا اس سے کیا رشتہ ہے ، یہی کہ ماں باپ کے بعد میں ہی اس کا کفیل ہوں ، اور مجھ پر یہ فرض عائد کر دیا گیا ہے کہ بڑے ہونے کے ناطے مجھے یہ سب کرنا ہے ، اور یہ عورت ——— ہر وقت میری جھوٹی خوشنودی کے لئے مصنوعی مسکراہٹ کا جال لئے مجھے قابو کرنے کے چکر میں رہتی ہے ——— میرا اس سے صرف بدن کا ہی ایک رشتہ ہے ، ضرورتوں کا رشتہ ، جذبوں سے عاری ، مجھے معلوم ہے اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ، صرف پہلی تاریخ کو ملنے والی تنخواہ نے اس کے قدم باندھ رکھے ہیں ، اور میں اس شخص کو بھی جانتا ہوں ، جس سے یہ اب بھی ہنس ہنس کر ملتی ہے ، وہ اس کا پرانا کلاس فیلو ، اب تو وہ کمبخت میرا افسر ہو گیا ہے ——— بس اس دن اتفاق ہی سے میں نے ان کی باتیں سن لی تھیں ، میں بھی تو حیران تھا کہ وہ آخر میرے گھر آنے پر اتنا مُصر کیوں ہے ———

لیکن میں اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

"ابو جی ـــــ آپ کب آئیں گے" ـــــ یہ آواز، جذبوں سے بھری یہ آواز، بس یہ ایک ایسا لمحہ ہے جب ساری بکھری ہوئی چیزیں ایک جگہ اکٹھی ہونے لگتی ہیں ـــــ ایک مرکزی نقطہ ـــــ میں جلدی سے باہر نکل آتا ہوں،

لگتا ہے میں ایک کمپیوٹر ہوں، احساس سے عاری، جذبوں سے خالی ـــــ گھر سے دفتر، دفتر سے گھر ـــــ دفتر میں وہ افسر ـــــ اور گھر میں یہ بیوی ـــــ"

"ابو جی ـــــ آپ کب ـــــ" نہیں نہیں میں اس آواز کو نہیں سننا چاہتا، میں کسی کو نہیں جانتا، کسی کو نہیں پہچانتا، تہہ میں ڈوبا ہوا پھول، پھول نہیں رہتا پتی پتی ہو کر پانی ہی بن جاتا ہے۔

یہ پانی کیا ہے؟

لیکن اس سے بھی پہلے یہ پھول کیا ہے، جو پانی کی سطح پر تیرتا ہے، پھر کسی دن اکیلا ڈوب جاتا ہے۔

ڈوبنے اور تیرنے کے درمیان یہ جو وقفہ

یہ کیا ہے

خواب کا یا جاگنے کا

اور ان کے درمیان ایک پل صراط ہے، جو اس پر سے جلدی سے گزر جائے وہ پار چلا جاتا ہے، جو نہ گزر سکے ہمیشہ کے لئے وہیں رہ جاتا ہے،

میں بھی درمیان ہی میں رہ گیا ہوں ـــــ تیرتے ہوئے ڈوب گیا ہوں اور ڈوب کر بھی تیرنے کی کوشش کر رہا ہوں ـــــ

خواب کیا ہے ــــــــــ جاگنے کا لمحہ کیا ہے
میں خواب دیکھ رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں ؟

(۳)

بہت دنوں سے مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تالاب کی ٹھہری سطح کے نیچے کوئی بڑی لہر مضطرب سی ہے۔ اس کی حرکتوں، اور گفتگو میں ایک عجب طرح کی بے چینی ہے،

یوں لگتا ہے یہ کوئی خود کلامی ہے۔ فائلوں پر جھکے جھکے وہ اچانک سر اٹھا کر خلاء میں کسی کو گھورتا ہے، بہت دیری تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد یوں سر ہلاتا ہے جیسے کسی سے باتیں کر رہا ہو، پھر انگوٹھے کی پور کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے دوبارہ فائلوں میں ڈوب جاتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں ــــــــ "کیا بات ہے، کس سوچ میں ہو؟"

وہ خالی نظروں سے دیکھتا ہے ــــــــ "فیصلے کا لمحہ بڑا دشوار ہے اور عجیب بھی"

"کیسا فیصلہ" میں حیرت سے پوچھتا ہوں

"ہونے یا نہ ہونے کا ــــــ خود کو دریافت کرنے کا" وہ یوں بولتا ہے جیسے میری بجائے کسی اور سے مخاطب ہو،

میں سوچتا ہوں شائد واقعی اس کا ذہن ماؤف ہو رہا ہے۔ کل اس کی بیوی بھی کہہ رہی تھی کہ اب تو کسی کو دکھانا ہی پڑے گا"

میں نے پوچھا ــــــــ "کیا ہوا؟"

کہنے لگی ــــــــ "بس بیٹھے بیٹھے جنون سا ہوتا ہے۔ لگتا ہے کوئی غیر مرئی چیز ان کے سامنے ہے جسے پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، یا پھر چپ چاپ

بیٹھے اپنے آپ سے باتیں کرتے رہتے ہیں ـــــ میں تو کہتی ہوں ان پر کسی کا سایا ہو گیا ہے "۔

"سایا ـــــ" وہ ہنسا ـــــ "ہم سب سائے ہی تو ہیں کسی اور کے"

اور یہ سایا بھی کیا چیز ہے ـــــ اصل سے علیحدہ بھی، منسلک بھی،
سائے معدوم ہوتے ہیں تو چیزیں وجود میں آتی ہیں اور چیزوں کے اجزا بکھرتے ہیں تو سائے بن جاتے ہیں
سائے سے وجود اور وجود سے پھر سایا
دائرہ در دائرہ ـــــ ایک سفر، نہ ختم ہونے والا سفر

"میں کیا کروں" ؟ اُس نے بڑی بے بسی سے پوچھا ـــــ "مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ میں سایہ ہوں یا وجود"

"کچھ بھی رہو ـــــ لیکن اپنے آپ کو محسوس کرو"

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا ـــــ "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو"
پھر مشین کی طرح اٹھا اور اپنا ٹفن بکس لیکر دفتر سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد مجھے یوں ہی احساس ہوا کہ اُس کی باتوں میں کوئی عجیب سی بات تھی، کوئی چھپی ہوئی بات جس نے مجھے بے چین سا کر رکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ گھر جانے سے پہلے اس کے یہاں سے ہوتا جاؤں گا، لیکن اس شام بچوں کے لئے کچھ چیزیں لینا تھیں، بازار میں برسوں پرانا ایک ساتھی مل گیا، اسی کا ذکر چھڑ گیا اور چائے پیتے ہوئے اتنی دیر ہو گئی کہ مجھے اس کے یہاں جانا یاد ہی نہ رہا۔

گھر پہنچا تو میری بیوی پریشان حال دروازے میں کھڑی تھی،

"خیر تو ہے" میرا دل ڈوب سا گیا۔

"انو بھائی نے خودکشی کر لی"

"کیا"

"صفدر آیا تھا کہہ گیا ہے کہ آپ جب بھی آئیں سول ہسپتال پہنچیں"

میں الٹے پاؤں واپس مڑا۔ ایمرجنسی کے کاریڈار میں صفدر اور اس کے کچھ رشتہ دار پریشان کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا اور میرے کندھے سے سر ٹکا کر رونے لگا۔

"میں نے پوچھا——"ہوا کیا؟

"انہوں نے ——— انہوں نے" وہ آنسوؤں میں بات مکمل نہ کر سکا

میں اسے ایک طرف کر کے اندر گیا

وہ زندگی اور موت کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ گلوکوز اور خون کی بوتلیں دونوں طرف ٹنگی ہوئی تھیں۔ میں قریب چلا گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے آنکھیں کھولیں، ان میں عجیب طرح کی چمک تھی۔ اپنے آپ محسوس کر لینے والی چمک،

میں نے کہا——"یہ تم نے کیا کیا؟"

وہ بولا نہیں ——— شائد بول ہی نہیں سکا

مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کروں، میں نے اس کی موت پر بھی جانے کیوں پرسا نہیں دیا تھا اور اب زندہ ہونے پر بھی مبارک نہ دے سکا،

بس کچھ کہے بغیر چُپ چاپ باہر نکل آیا۔

آئینہ تمثال دار

زندگی کے تھکے تھکے بوڑھے راستوں پر بوند بکھرنے کے دوران گئے
دن بہت یاد آتے ہیں، سورج ڈوبنے کا منظر عجیب سا لگتا ہے۔ یوں محسوس
ہوتا ہے جیسے وقت کی بانسری نے ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے کر ساکت کر
دیا ہے، بس ایک سرمئی سا ہیولہ متحرک ہے جو کھینچ کر ماضی کے دھندلکوں
میں لئے جا رہا ہے ــــــ لیکن ماضی بھی تو اب تصویر کی طرح ہے اور
تصویروں میں کھو جانے کی اپنی ایک لذت ہے، دکھ کا مزہ، زندگی کی پگڈنڈیوں
پر بہت کچھ بھول آنے کی کسک،
شام کے دھندلکوں میں کیفے ٹیریا کے کسی ویران کونے میں وہ کھنکتی
آواز ــــــ اب یوں لگتا ہے جیسے وقت نے اس آئینہ تمثال دار
کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے ــــــ وہ ہفت رنگ منظر، آوازوں
سے گونجتے، چہروں سے روشن ہوتے منظر،
سب کچھ بکھر گیا ہے، ان منظروں میں چہچہاتے پرندے اپنی اپنی ڈالیوں
سے اڑ کر جانے کن کن پنجروں میں، کہاں کہاں بند چکے ہیں، وقت کے

صیاد نے ہمیں اپنے جال میں پکڑ کر زمانے کے بے رحم ہاتھوں میں بیچ دیا ہے،
اور زمانے نے ہمیں اپنے اپنے ڈرائنگ روموں میں سجا لیا ہے، جہاں نہ
آواز ہے، نہ چہرہ،

آوازوں اور چہروں کے بغیر زندگی عجب مضحکہ خیز محسوس ہوتی ہے۔
اردگرد کے لوگ جن کے ساتھ عمریں بیت جاتی ہیں لیکن دل نہیں کھلتے، عمر بھر ساتھ
ساتھ رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے سربستہ راز، ایک دوسرے
سے خوف زدہ،

اور تمنا ہے کہ ٹمٹماتی شمع کی طرح نہ بجھتی ہے نہ کھل کر جلتی ہے۔

ایک درویش پر بڑا خوف طاری تھا، کسی نے پوچھا ــــــ "یہ خوف
کس لئے؟"

جواب دیا ــــــ "محبوب کے حضور پیش ہونے جا رہا ہوں"

پوچھنے والے نے پوچھا ــــــ "تو پھر خوف کیسا؟"

جواب دیا ــــــ "جو کچھ اندر ہے ظاہر ہو جائے گا ــــــ باطن اور ظاہر کا فرق
جاتا رہے گا۔"

بعض اوقات آدمی اس فرق سے ماورا ہو جاتا ہے لیکن اظہار نہیں کرتا، اظہار
کرنا ہی تو مشکل ہے، ایک عمر تک تو اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی لیکن جب بچے
جوان ہو کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں تو زندگی بہت سپاٹ ہو جاتی
ہے، کھڑکی سے طلوع ہوتے اور ڈوبتے سورج کا منظر ایک سا لگتا ہے۔ اور شام
دبے پاؤں اپنی طرف بڑھتی محسوس ہوتی ہے،

بس زندگی اتنی سی تو ہے

درمیانے درجے کے گھر میں پیدا ہو کر خواب دیکھنا، کالج کے دنوں میں خاموش

سا عشق کرنا اور کتابیں رٹ رٹ کر چھوٹا موٹا افسر بن جانا ______ پھر روائتی سگھڑ بیوی، بچے ،بچوں کا مستقبل اور اب زندگی کی شام ،جس کی دہلیز پر کھڑے ہو کر ،مڑ کر دیکھتا ہوں تو سب دھندلکا ______ دھندلکا ،

کسی نے کہا تھا میری حالت پتھر کی سی تھی لیکن مرشد کی نظر نے مجھے گوہرِ آب دار بنا دیا ______ گوہرِ آب دار بننا تو بہت آسان ہے پتھر رہ کر گوہرِ آب دار کی تمنا کرنا کتنا مشکل ہے ۔

زندگی کے اس طویل سفر میں کیا کھویا ، کیا پایا ______ اس کا حساب کون کر سکتا ہے ، عمر کے اس حصہ میں تو صرف یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں ، وقت نے یادداشتوں کے رنگ محل میں کئی دراڑیں ڈال دی ہیں ______ بس ایک کھنکتی آواز اور چمکتا چہرہ ہی باقی رہ گیا ہے ______

کہتے ہیں جنگل میں کسی درخت کی شاخ پر پرندوں کا ایک جوڑا انصال کے لمحہ اور نشہ میں مگن تھا کہ کسی شکاری نے انہیں نشانہ بنایا ۔تیر دونوں کو چیرتا ہوا اس طرح گزرا کہ دونوں اس میں پروئے گئے ،

یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ دونوں لذت کی اس گھڑی میں ایک ساتھ ہست سے نیست میں داخل ہوئے ،معلوم نہیں لذت کی یہ کیفیت ان کے ساتھ ساتھ گئی یا اسی دنیا میں رہ گئی ، درخت کی شاخ پر جوڑ کھانے کا فیصلہ تو اپنا تھا لیکن شکاری کا تیر اپنا نہیں تھا ______ بس ہمارے فیصلے بھی اپنے ہوتے ہوئے بھی اپنے نہیں ہوتے ،میں نے اُسے کہا تھا ______ "میں اپنی دنیا خود بنانا چاہتا ہوں"

اب لگتا ہے اس سے بے معنی بات اور کوئی نہیں تھی ۔

بعض اوقات ہم بہت معمولی چیزوں کے بارے میں غیر معمولی سنجیدہ گفتگو

کرتے ہیں اور بعض اوقات اہم معاملات کے بارے میں انتہائی غیر سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

اسے مجھ سے گلہ ہی یہ تھا کہ میں کسی معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوتا،

وہ کہتی ــــــ "ایک بار ابو سے ملو تو سہی"

میں کہتا ــــــ "کیا فائدہ"

وہ کہتی ــــــ "دیکھو میں تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں"،

میں کہتا ــــــ "لیکن مجھ میں جو سکت نہیں"

لیکن اب اتنے برسوں بعد سمجھ آیا ہے کہ یہ ساری باتیں بے معنی تھیں، اصل سبب میرا مڈل کلاس اخلاق اور اس کا دیا ہوا احساس کمتری تھا، میں تو اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا پڑا تھا، باہر کی چیزوں کو کیسے جوڑ پاتا ــــــ یہ ٹکڑے ابھی تک نہیں جڑے، اس دن بھی جب ہم آخری پرچہ دے کر کیفے ٹیریا کی کونے والی میز پہ خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے، اس دن بھی میری یہی حالت تھی،

وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی تھی

یہ ہماری آخری ملاقات تھی،

گھر کی طرف آتے ہوئے مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں زندگی کا راستہ بھول گیا ہوں۔ اب معلوم نہیں اس بھول میں قصور میرا تھا یا وقت نے ماہر لائن مین کی طرح عین وقت پر کانٹا بدل دیا تھا ــــــ بس میں راستہ بھول گیا اور جنگل میں جا پہنچا،

جنگل میں اپنی شناخت نہیں رہتی ــــــ زندگی ایسے ہی گزر گئی معمول کا پہیا ــــــ شادی، بچے، ان کی تعلیم، اور اب زندگی کی شام

ہو چلی ہے ۔

ایک شام جب سرمئی بدل آسمان پر تیر رہے تھے ، کرشن بہت اداس تھے ، کسی گوپی نے پوچھا ——— "مہاراج کیا بات ہے"

بولے ——— "رادھا یاد آرہی ہے ———"

گوپی نے گھوڑے پر زین کسی اور کالی ڈراونی رات کا سینہ چیر کر رادھا کو لینے چلی ،

معلوم نہیں وہ رادھا کو ساتھ لاسکی یا نہیں ، لیکن اس کا یوں چلے جانا بھی تو ایک بات ہے ،

آخری پرچے والے دن کیفے کی اُس میز پر جو آئینہ تمثال دار ٹوٹا تھا وہ پھر کبھی نہ جڑ سکا ، لیکن اس کے بکھرے ٹکڑوں میں یادوں کے کئی عکس جھلملاتے رہے ——— میرے پاس اس کی یہی ایک تصویر ہے جو ایک ٹوٹے ہوئے ٹکڑے میں سے جھانک کر مجھے اپنی طرف بلاتی رہتی ہے ——— میری زندگی اب خود ایک ٹکڑا ہے ——— بڑے منظر سے ٹوٹا ہوا ایک ٹکڑا ، بچے جوان ہو کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے ہیں ، بیوی بہوئیں تلاش کرتی پھر رہی ہے اور میں کھڑکی کے سامنے کھڑا سورج کے طلوع ہونے اور ڈوبنے کا منظر دیکھتا رہتا ہوں ،

کسی شام میں بھی یوں ہی زندگی کے افق سے نیچے اتر جاؤں گا ، کسی نامعلوم جہان میں ، لیکن یہ بات مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکے گی کہ یہ آئینہ تمثال دار کس نے توڑا ، میں نے ، اس نے یا زمانے نے ،
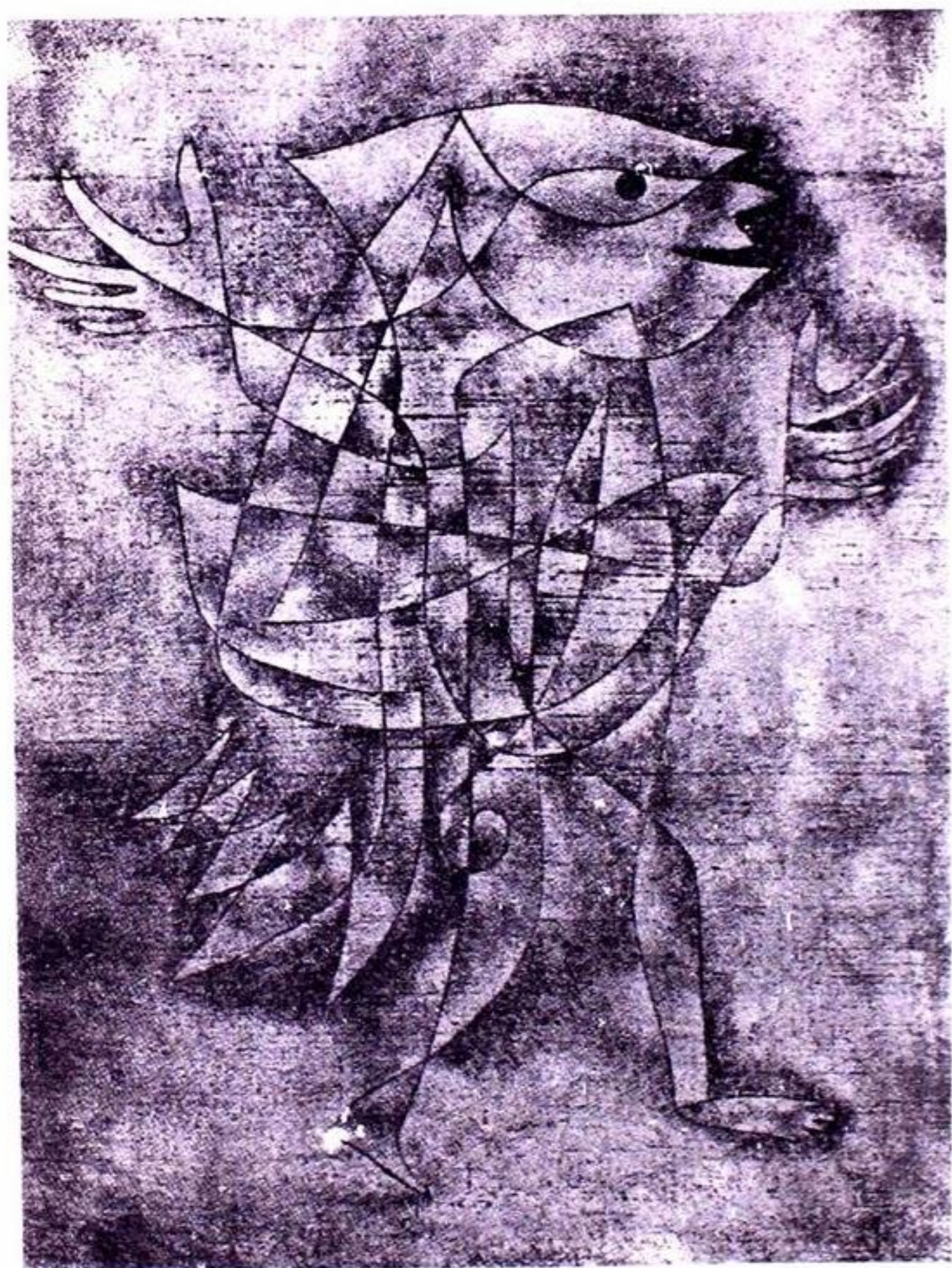
سناٹا بولتا ہے ۲

ہم سب زمانے کے کاغذ پر دم توڑتے ہوئے وہ حرف ہیں، جنہیں بے معنویت کی دیمک چاٹ گئی ہے۔

وہ ان دم توڑتے ہوئے حرفوں میں ایک ایسا کردار ہے، جس کا کوئی نام نہیں۔ ایک زمانے میں اس کا ایک نام تھا، لیکن مسلسل بولے جانے کے بعد اب اسے اپنے نام کے حرفوں میں کوئی دلکشی نظر نہیں آتی، اس لئے اس نے اپنے نام کے حروف اپنی پیشانی سے کھرچ ڈالے ہیں، اور اپنا نام وہ رکھ لیا ہے، ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد وہ اسے بھی مٹا دے اور اپنا نام زیرو رکھ لے، لیکن یہ تو بعد کی بات ہے، فی الحال اس کا نام وہ ہے۔

وہ کے صبح و شام معمول کے غلاف میں اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ ان کی پہچان باقی نہیں، اس لئے اگر کبھی صبح شام کو اور شام صبح کے وقت بھی طلوع ہو جائے تو اسے خبر نہیں ہوتی۔ اس کی ہر سوچ گھڑی کے ڈائل میں قید ہے، اور سانسیں سوئیوں کی ٹک ٹک میں پروئی ہوئی ہیں۔ وہ دن کے بستر پر پڑا ہوا ایسا مریض ہے، جس کی بیماری اور معمولات کا چارٹ اس کے سرہانے لٹک رہا ہے۔ اس کی صبح سات

بجکر پندرہ منٹ پر شروع ہوتی ہے۔ جب وہ نوکر کے تیسری بار ہلانے پر آنکھیں کھولتا ہے، اور اپنے آپ کو اسی نارنجی رنگ کی چھت کے نیچے اُن ہی پرانی دیواروں میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ یہی سوچ کر سوتا ہے کہ صبح جب وہ سو کر اٹھے گا تو اس کی آنکھ کسی اور کمرے میں کھلے گی، لیکن ہر صبح وہ اسی پلنگ پر ہوتا ہے جس کا ایک پایا اپنی جگہ سے ہلا ہوا ہے، اسے کبھی کبھی اس پائے پر رشک آتا ہے کہ اس کمرے میں جہاں ہر چیز اپنی مقررہ جگہ میں قید ہے۔ کم از کم یہ پایا تو ایسا ہے جو اپنی جگہ سے ہلا ہوا ہے، اور جب بھی کوئی اس پلنگ پر بیٹھنے لگتا ہے، یہ پایا اپنی حرکت سے اپنے الگ ہونے کا احساس دلا دیتا ہے اس نے کئی بار کوشش کی تھی کہ وہ اس پائے کی طرح اپنے علیٰحدہ ہونے کا احساس دلائے اور کسی طرح اس کمرے کی فضا پر جم کر بیٹھی یکسانیت کو جھنجوڑ ڈالے اس نے کئی بار کمرے میں رکھی چیزوں کی ترتیب بدلی تھی، لیکن اس کی بیوی انہیں پھر پرانی ترتیب میں لے آئی۔ عرصہ تک میاں بیوی کے درمیان یہ خاموش کھیل جاری رہا۔ وہ صبح اٹھتے ہی چیزوں کی جگہیں بدل دیتا، لیکن جب دفتر سے لوٹتا تو ہر چیز واپس اپنی جگہ چلی گئی ہوتی اور کمرہ پھر اُسی مانوسیت اور یکسانیت کے نیچے میں پھڑ پھڑا رہا ہوتا۔ ایک طویل عرصہ تک اُس کے اور بیوی کے درمیان یہ خاموش جنگ جاری رہی، پھر ایک صبح یوں ہوا کہ جب نوکر نے تیسری بار اسے ہلایا تو اس نے خاموش تھکی ہوئی نظروں سے چیزوں کو دیکھا، اور چپ چاپ باتھ روم چلا گیا۔ اس دن جب وہ دفتر سے لوٹا تو اس کی بیوی بہت خوش تھی، اتنی خوش تھی، اتنی خوش کہ اُسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ اُس کے خاوند نے اپنی پیشانی سے اپنے نام کے حروف کھرچ لئے ہیں اور اپنا نام وہ رکھ لیا ہے۔ اُس دن کے بعد اس نے کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا، اور کمرہ ہی کیا، دوسری چیزوں کے بارے میں بھی ان کی مقررہ جگہوں سے سمجھوتہ کر

لیا۔ اب اُس نے دفتر میں کوئی غلط فیصلہ دینے پر اپنے بڑے افسر سے جھگڑنا چھوڑ دیا ہے۔ دوستوں سے غلط باتیں سن کر انہیں ٹوکنا ترک کر دیا ہے، کتابوں میں بے علمی کی باتیں پڑھ کر ان کے مصنفوں کو خط لکھنا بند کر دیا ہے، اب وہ نہ تو بیوی کو رنگوں کے بھونڈے چناؤ پر کچھ کہتا ہے، اور نہ سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کی بُری حرکات اُسے بُری لگتی ہیں۔ اس کے آس پاس کچھ ہی ہو جائے، اس کے بدن کی دیواروں پر ذرا سا ارتعاش بھی نہیں ہوتا۔ اب وہ سارا اخبار مزے لے لے کر پڑھ جاتا ہے سب سے ملتا ہے، سب کی سُنتا ہے، بات بات پر قہقہے لگاتا ہے، کیوں کہ اب وہ ــــــ وہ ہے، صرف وہ، جس نے اپنے نام کے حرف اپنی پیشانی سے کھُرچ ڈالے ہیں۔

معمول کے دائرے میں گھومتے ہوئے ابتدا میں اُسے کبھی کبھی بڑی دقّت ہوتی تھی کیوں کہ اس کی شخصیّت کے بعض دندانے دار کنگرے دائرے میں گھومتے گھومتے کہیں اڑ جاتے اور وہ شخص جس کے نام کے حروف اس نے اپنی پیشانی سے کھُرچ ڈالے تھے، اس کے بدن کے ملبے میں کروٹیں لینے لگتا۔ غلاف میں لپٹے ہوئے صبح و شام پھڑ پھڑانے لگتے اور کھُرچے ہوئے نام والا شخص اُس کے بدن کی چار دیواری سے سر نکال کر باہر جھانکنے لگتا، لیکن اگلے ہی لمحے معمول کا ریلا اُسے اپنے ساتھ بہائے لئے چلا جاتا، اور اب اس دائرے میں مسلسل گھومتے گھومتے اس کی شخصیت کے سارے دندانے دار کنگرے بھُر گئے ہیں، اور وہ گریس لگے بیرنگ کی طرح بغیر آواز دیئے اپنے محور پر گھومتا رہتا ہے۔

کئی دنوں سے یہ سوچ اس کے ذہن کی نالیوں میں رینگ رہی ہے کہ وہ مر چکا ہے، ان چلتے پھرتے سانس لیتے لوگوں میں لاش کی طرح ہے، جو صبح سات بج کر پندرہ منٹ پر اپنی قبر سے نکلتا ہے، اور خود کو گھڑی کی سوئیوں کے حوالے

کر دیتا ہے ٹِک ٹِک کی آوازوں کے ساتھ جب ڈائل کا چکر مکمل ہو جاتا ہے تو وہ واپس اسی قبر میں آ گرتا ہے، اور بیوی کے گرم گداز جسم سے لپٹ کر سو جاتا ہے۔ بس اس کی زندگی میں اب یہ چند لمحے ہی اس کی زندگی کے لمحے ہیں، ساری رات اور دن سوتا رہتا ہے، لیکن ان چند لمحوں میں وہ کچھ دیر کے لئے جاگتا ہے، اور پھر اسی گہری، موت ایسی نیند کی دلدل میں لوٹ جاتا ہے۔

اس کا یہ احساس کہ وہ مر چکا ہے، اتنی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ ایک دن وہ ڈائل کے ہندسوں کی چار دیواری سے باہر کود جاتا ہے اور فائلوں کے ڈھیر کو میز پر چھوڑ کر سڑک پر نکل آتا ہے، وہ دیر تک مختلف سڑکوں پر پھرتا رہتا ہے، پھر چائے پینے کے لئے ایک ریستوران میں داخل ہوتا ہے، ریستوران کی فضا میں آواز ننگی ہو کر ناچ رہی ہے اور لوگ پتھر کے ہو چکے ہیں۔ ان کی آنکھیں گندی میزوں پر جمی ہوئی میل میں پروئی ہوئی ہیں اور کان آواز کی تال پر ناچ رہے ہیں۔ اس کے اندر آنے پر کوئی سر اٹھا اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ وہ کچھ دیر دروازے میں کھڑا میزوں کا جائزہ لیتا ہے: ساری میزیں کھچا کھچ بھری ہوئی ہیں۔ ایک میز پر دو شخص بیٹھے ہیں وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی سر اٹھا کر نہیں دیکھتا کہ وہ کون ہے؟

"یہ لوگ کون ہیں، اور میں کہاں آگیا ہوں" ـــــ وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے" سب لوگ پتھر کے ہو چکے ہیں کہ ان کے چہروں پر مایوسی اور اداسی کھدی ہوئی ہے، چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ سوچتا ہے ـــــ کیا ان سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا، اور کیا اب مجھے بھی پیچھے مڑ کر دیکھنا ہوگا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا ہے کہ دروازے سے ایک ہیجڑا اندر داخل ہوتا ہے، اور درمیان میں پہنچ کر ناچنے لگتا ہے، اس کے ساتھ ہی جھکے ہوئے چہرے اوپر اٹھنے لگتے ہیں، اور پتھر کے دھڑ پگھلنے لگتے ہیں۔ ہیجڑا ناچتے ناچتے کبھی کسی کے سر پر چپت رسید کرتا، کبھی کسی کے گال پر چٹکی لیتا ہے تو لوگ

خوشی سے تالیاں پیٹنے لگتے ہیں، ہیجڑا ناچتے ناچتے باہر نکل جاتا ہے، اُٹھے ہوئے سر دوبارہ ڈھلک جاتے ہیں، اور وجود پتھر میں ڈھلنے لگتے ہیں۔

"اس سے پہلے کہ میں بھی پیچھے مڑ کر دیکھوں، مجھے یہاں سے نکل بھاگنا چاہیئے" وہ سوچتا ہے اور دوڑتا ہوا باہر نکل جاتا ہے

سڑک پر ٹریفک رکی ہوئی ہے، چوک میں دو ٹرک آمنے سامنے آگئے ہیں۔ اور دونوں میں سے ہر ایک بضد ہے کہ پہلے دوسرا حرکت کرے۔ ان کے پیچھے دونوں طرف بسوں، ٹانگوں اور کاروں کی لمبی قطاریں بڑے اطمینان سے کھڑی ہیں۔ کچھ لوگ چوک میں جمع ہو گئے ہیں اور مزے سے دونوں ٹرک ڈرائیوروں کے مکالمے سن رہے ہیں۔ وہ قریب کھڑے ایک شخص کو ہاتھ لگاتا ہے۔ وہ شخص پتھر کا ہے، پھر وہ قطار میں کھڑی ایک کار کو چھوتا ہے۔ وہ بھی پتھر کی ہے۔ وہ ایک اور شخص کو چھوتا ہے، وہ بھی پتھر کا ہے۔ ایک، دو، تین، چار۔ سب پتھر کے ہیں۔ ان سبھوں نے بھی پیچھے مُڑ کر دیکھا ہوگا، وہ سوچتا ہے اور گلی میں سے گزر کر دوسری سڑک پر جا نکلتا ہے۔ سڑک کے دوسرے کنارے ہجوم کے قریب جاتا ہے۔ مداری ڈگڈگی بجا رہا ہے، لوگ اس کی تال پر ناچ رہے ہیں۔

"تو یہ بھی پتھر کے ہیں" وہ سوچتا ہے اور گلیوں میں سے ہوتا ہوا ایک اور سڑک پر آ جاتا ہے، لیکن یہاں بھی لوگ پتھر ہیں وہ جس سڑک پر جاتا ہے، ہر جگہ پتھر ہی پتھر ــــ پتھر ہی پتھر،

وہ دوڑ کر اپنے ڈائل پر چڑھ جاتا ہے اور پرانے ہندسوں کی چادر اوڑھ لیتا ہے، کم از کم یہاں سوئیوں کی ٹک ٹک تو ہے۔

رات کو بیوی کے پاس لیٹے ہوئے سوچ اس کے ذہن سے اُبل کر باہر آگرتی ہے۔ ریستوران میں بیٹھے، سڑکوں پر پھرتے لوگ، ایک ایک کرکے اس کی آنکھوں

کے روشن دان سے اندر آتے لگتے ہیں۔ اس کے جسم کے ملبے میں مدت سے دفن، کھرچے ہوئے نام والا شخص، پہلو بدلتا ہے۔ لفظوں کے سوکھے چشمے اُبلنے لگتے ہیں۔ پورے شہر میں ایک وہی تو ہے جسے اپنی بے معنویت کا احساس ہے، ــــــ وہ اچھل کر اُٹھ بیٹھتا ہے، اس سارے شہر میں وہی تو ایک تنہا زندہ آدمی ہے، وہ زور دار قہقہہ لگاتا ہے،

ہاں، اس سارے شہر میں وہی تو ایک تنہا زندہ آدمی ہے، جس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا،

وہ ہنستا چلا جاتا ہے، پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔

اُس کی بیوی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہتی ہے ــــــ "کیا ہوا ــــــ کیا ہوا؟"

لیکن وہ جواب دیئے بغیر بلک بلک کر روتا رہتا ہے۔

اس رات کے بعد وہ کبھی نہیں رویا،

لیکن یہ بات آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکی کہ اُس رات وہ بلک بلک کر کس کے لئے رویا تھا؟
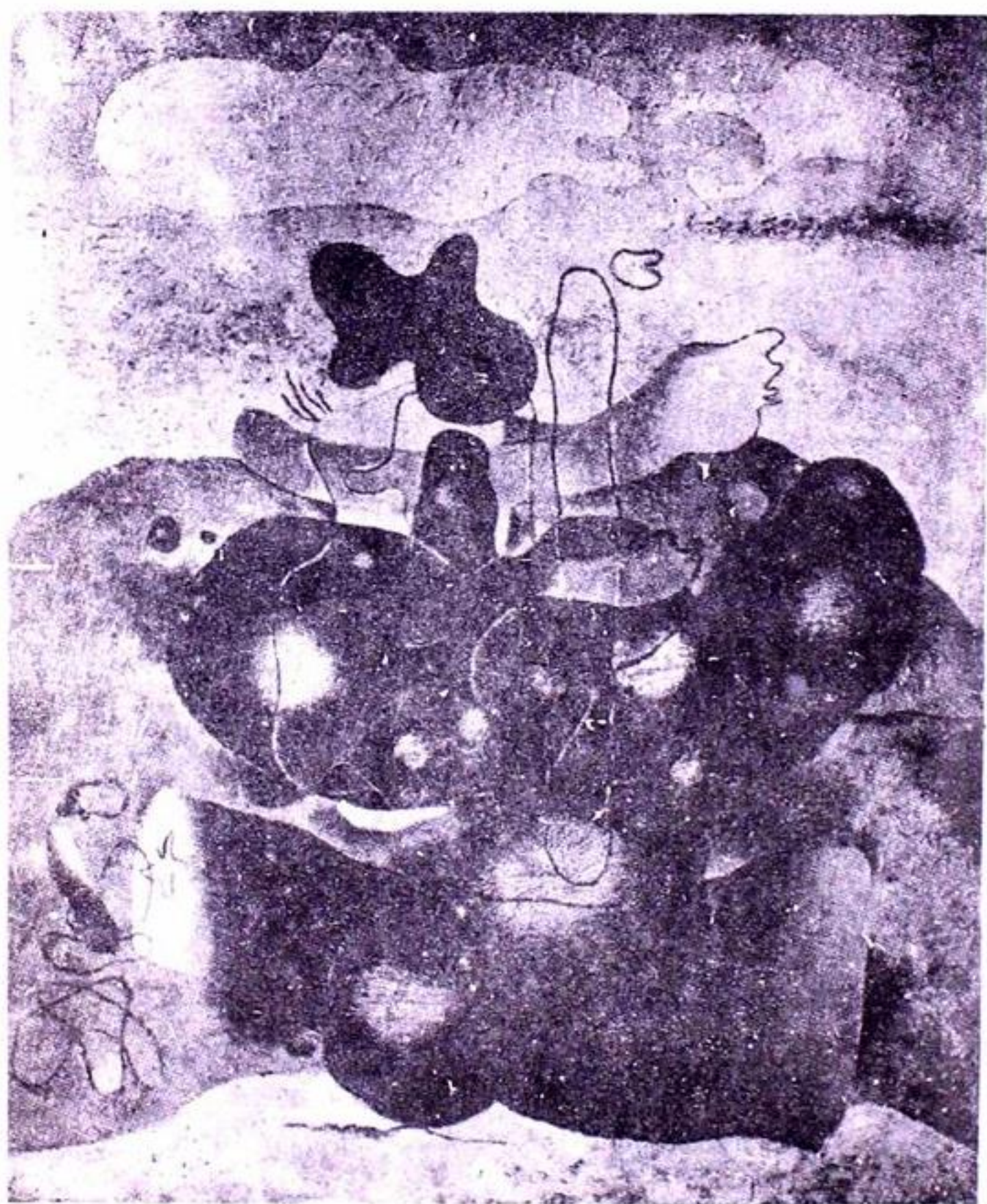
بند کنوئیں میں سرسراہٹ

یہ بات شاید صبح ہوئی ، دوپہر کو یا رات کو کسی وقت ، اب اسے ٹھیک سے یاد نہیں ۔ بس اس کا پہلا احساس یہ تھا کہ اس کے اندر سے کوئی پھڑپھڑا کر باہر نکلا اور فضا میں بلند ہو گیا ۔ ملگجی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ایک دشت ہے ، ہُو کا عالم اور وہ بیچوں بیچ کھڑا اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے اتنے میں کہیں سے ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور چند لمحے اس کے گرد چکر لگاتا رہا پھر اس کے اندر داخل ہو گیا اب ایک اور ہی منظر ہے ۔

وہ بھرے بازار کے بیچوں بیچ کھڑا ہے لوگوں کا اژدھام ہے ، سارے لوگ بھاگے جا رہے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ دوڑتا چلا جاتا ہے ۔ منظر پھر بدلتا ہے ۔ اور اب وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہے ، میز پر فائلوں کا انبار ہے ۔ بس یہ ساری کہانی ہے ۔ ایک لمحہ یا کئی سو لمحوں کی یہ اسے معلوم نہیں ۔

یہ واردات اچانک ہو جاتی ہے ، اسے اس وقت پتہ چلتا ہے جب ہو چکتی ہے ۔ اس کے بعد بہت دیر تک اسے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے بید سے اس کی پٹائی کی ہے اور روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا ہے ۔ فائلوں کے حرف

اسے بے معنیٰ لگتے ہیں، چہروں پر چڑھے ہوئے ماسک اتر جاتے ہیں اور ہر چیز اپنی جگہ سے کھسکی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ گھر میں ہوتا ہے تو بیوی کی باتوں میں ایک عجیب تصنع محسوس ہوتا ہے، بچوں کی آوازوں میں بے سُرا پن آجاتا ہے۔ سارا کچھ گھروندے کی طرح بھر بھُراتا محسوس ہوتا ہے۔

اجنبی فضاء میں اڑتا پرندہ اپنا راستہ بھول گیا ہے کیا پرندے بھی راستہ بھُول جاتے ہیں؟ اور اسی لمحہ یہ اذیت کہ وہ ساری عمر اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا ہے جو نہ بنا، وہ بنتا رہا اور جو بنا وہ تھا نہیں۔ شاید اب بھی نہیں۔

ویسے دیکھنے کو اسے کوئی دُکھ نہیں، سجا سجایا گھر، ماڈرن بیوی، پھول ایسے بچے، عزّت والی نوکری۔

"بیوی کہتی ہے ـــــ تم بڑے ناشکرے ہو، اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے ہمیشہ اپنے آپ کو کوستے رہتے ہو۔"

اس کے پاس جواب نہیں ـــــ کیا واقعی میں ناشکرُا ہوں۔؟

لمحہ بھر کے لئے لگتا ہے بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے آخر اسے فکر کس بات کی ہے۔ لیکن ساری مصیبت، تو اس پرندے کی ہے جو اس کے جسم کے قفس میں کہیں پھڑ پھڑاتا ہے اور کبھی کبھی اچانک باہر نکل کر کھلی فضا میں ایک چکر لگاتا ہے اور پھر اس کے جسم کے ملبہ میں دفن ہو جاتا ہے۔

تو کیا میں کوئی قبر ہوں؟

کیا قبریں بھی احساس رکھتی ہیں، ان کا بھی کوئی جذبہ ہوتا ہے؟

یا پھر یہ کہ میں کوئی اور ہوں اور قبر میرے ارد گرد کہیں اور ہے جو مجھے تو نظر نہیں آتی شاید اس پرندے کو دکھائی دیتی ہے۔

تو کیا میں خود پرندہ ہوں؟

لیکن میں تو ا ا ین ب ہوں ۔

"ڈیڈی ــــــــــ"

"جی بیٹے ــــــــــ"

"شام کو آئسکریم کھلانے لے جائیں گے نا"

"جی بیٹے ــــــــــ"

"میرے لئے ساڑھی ــــــ میرے لئے ــــــ میرے لئے ــــــ"

دن فرمائشوں کے دھاگوں سے بُنا ہوا دِن ،

رات ــــــ سمندر سے بھی گہری رات ،

وہ ان دونوں کے درمیان کہیں اٹکا ہوا ہے ۔

پرندہ پھڑپھڑاتا ہے ــــــ اس کے اندر ایک قلابازی کھاتا ہے

اور پھر سے اُس کے حلق سے ہوتا فضا میں بلند ہو جاتا ہے وہ آنکھوں پر دونوں

ہاتھوں کا چھجا بنا کر اُسے فضا میں اُڑتے دیکھتا ہے ۔

کچھ دیر بعد یہ پرندہ اپنے پنجرے میں لوٹ آئے گا ۔

ہاں لوٹ آئے گا

ڈیڈی ــــــ اس کا بیٹا پکارتا ہے ۔

"اجی سنیئے نا ــــــ" بیوی کچھ کہہ رہی ہے ۔"

ابو ــــــ بیٹی ہاتھ ہلا رہی ہے

جناب میرا کیس ــــــ کوئی کہہ رہا ہے ۔

"سر ــــــ یہ فائل بہت ضروری ہے اس کا پی اے میز پر جھکا ہوا ہے۔

پرندہ کہاں جائے ۔ اتنی ساری قینچیاں اس کے پر کاٹ رہی ہیں ۔

وہ ایک لمبی آہ بھرتا ہے اور سوچتا ہے کبھی تو یہ ساری قینچیاں ٹوٹیں گی

نئے پَر نکلیں گے اور پرندہ فضا میں اونچا اور اونچا اڑتا چلا جائے گا۔

لیکن کب ــــــــــ؟

پھر خود ہی مسکراتا ہے ــــــــ میں بھی عجیب ہوں۔ اپنے آپ کو خود ہی مٹانے پر تُلا ہوا ہوں

اُسے جُھرجُھری آتی ہے ــــــــــ

لیکن سب سے الگ فضا میں اڑنے کی خواہش۔

خواہشیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ہیں نا،

وہ اندر ہی اندر مسکراتا ہے اور پی اے سے کہتا ہے۔

"تو بھئی پہلے ذرا بیگم صاحبہ سے بات کروا دو، پھر آپا کو بہت دن ہو گئے آج اس فائل کو ضرور ڈسپوز آف کرنا ہے"۔
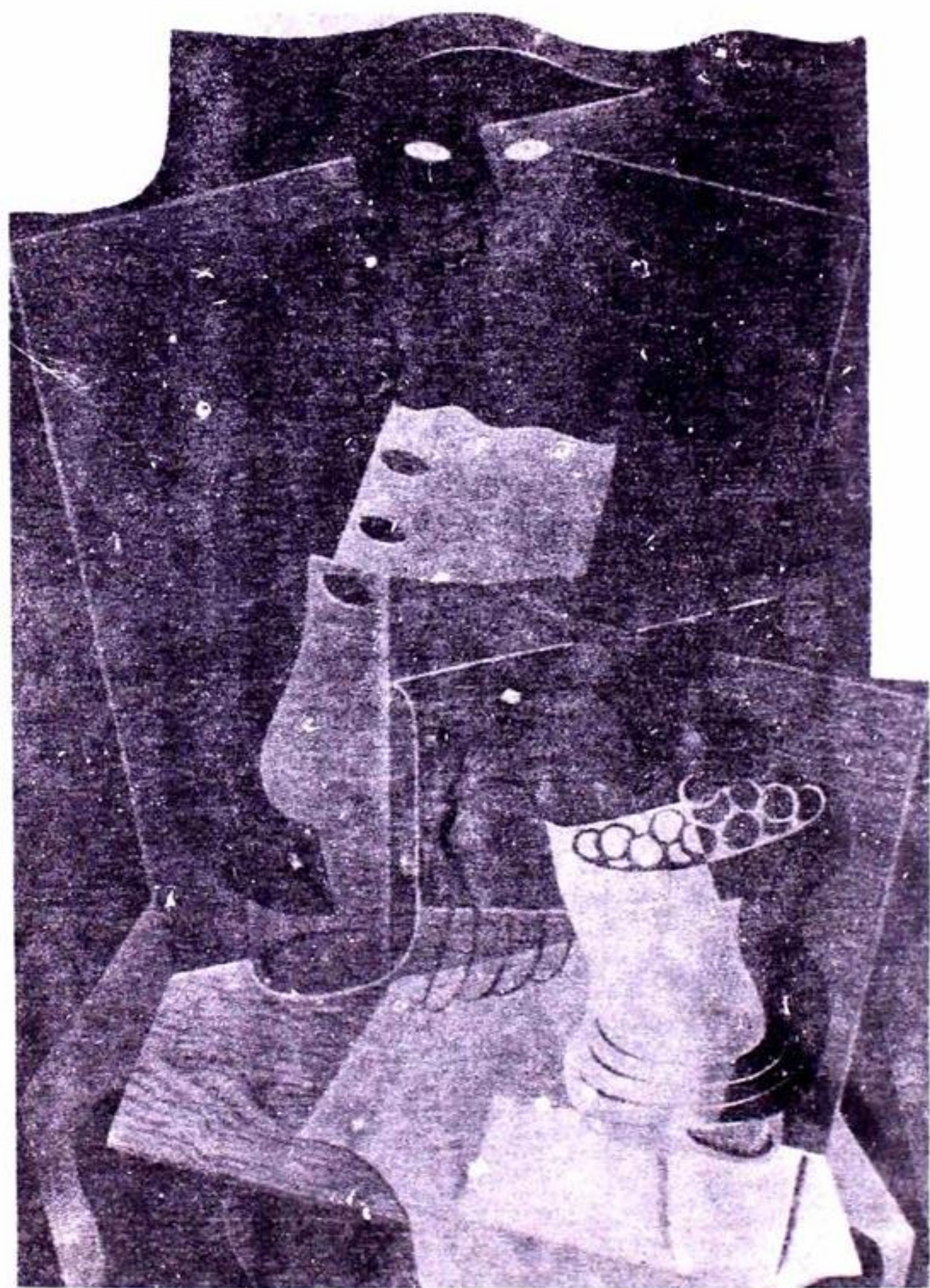
چپ صحرا

پہلے گواہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا ـــــــ "جناب عالی یہ واقعہ نہ تو میرے سامنے ہوا ہے اور نہ مجھے اس کے بارے میں کوئی ذاتی علم ہے، لیکن میں مفادِ عامہ کے لئے گواہی دینے حاضر ہو گیا ہوں جناب۔ میں اس شخص کو ذاتی طور پر نہیں جانتا، لیکن میں نے سنا ہے کہ یہ لفظوں کی حرمت پر یقین رکھتا ہے اور کھلم کھلا ہمارے خیالات کی نفی کرتا ہے۔ ایسا شخص معاشرے کے لئے انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ آزادیٔ اظہار کی بات کرتا ہے۔ آپ ہی بتایئے جناب والا! یہ بھی کوئی کرنے کی بات ہے۔ بس جناب لمبی چوڑی بات کیا کرنا۔ آپ فوراً اس کو سزا سنائیں، میرے خیال میں تو کسی اور گواہی کی ضرورت بھی نہیں۔ میری گواہی کافی مضبوط اور مدلّل ہے۔"

(۲)

میں آپ کو ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ لیکن میری آواز کو دیمک لگ گئی ہے، لکھ بھی نہیں سکتا کہ قلم زنگ آلود ہے۔ کمرے میں ایک عجب پراسرار خاموشی ہے، کمرے کے باہر تاریک راتوں میں جو سانپ شونکتا رہتا تھا، رینگ کر کمرے کے اندر چلا آیا

ہے۔ میں نے سنا تھا کہ سانپ نے حضرت سلیمان سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ کسی لکھنے والے کے کمرے میں نہیں جائے گا۔ اب یا تو اس عہد کا عرصہ ختم ہو گیا ہے یا سانپ نے بد عہدی کی ہے، یا پھر حضرت سلیمان نے ہی اسے اجازت دے دی ہے۔ بہر حال کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے کہ سانپ لکھنے کی میز پر بیٹھا ہوا ہے اور میں سہما ہوا کونے میں کھڑا ہوں اب شائد میں رینگ رینگ کر باہر نکل جاؤں گا اور سانپ میری جگہ لکھنے کا کام کرے گا۔ دراصل پچھلے چند دنوں سے کچھ عجیب گڑبڑ ہو رہی ہے۔ ابھی پرسوں ہی کی تو بات ہے گھڑیاں اُلٹی چلنے لگیں۔ لوگ خوش ہو ہو کر تالیاں بجاتے تھے۔ میں نے چیخ کر کہا کہ یہ بُرے وقت کی دلیل ہے۔ اس پہ ماتم کرو لیکن میری بات سننے کی بجائے لوگوں نے الٹا مجھے لعن طعن شروع کر دیا۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا اور اب صورت یہ ہے کہ گھڑیاں مسلسل پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہیں اور ہم صدی صدی پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ چند دنوں میں ہم پتھر کے زمانے میں داخل ہو جائیں گے۔

(۲)

"یا ہو" ــــــــ اس نے نعرہ لگایا اور غار پر حملہ کر دیا۔ غار والے بے خبری کی نیند سو رہے تھے۔ نعرہ سن کر ہڑ بڑا کر اٹھے۔ اتنے میں اس نے مرد پر حملہ کر دیا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس کے نرخرے میں اپنے دانت اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ تازہ گرم خون کے پہلے گھونٹ نے ہی اس کے ہاتھوں کی گرفت میں سختی پیدا کر دی۔ غار والی عورت اس دوران سہمی ہوئی دیوار سے لگی کھڑی رہی۔ اس نے آخری قطرہ چوس کر شکار کو چھوڑ دیا اور اچھل کر عورت کو دبوچ لیا۔ پھر اسے کندھے پر ڈال کر باہر نکلا ــــــــ

"یا ہو ــــــــ یا ہو"

(۴)

عجب خوفناک بات ہے ــــــــ میں کہانی لکھنا ہی بھول گیا ہوں یہاں تو ہر شخص اندر سے ڈریکولا بن چکا ہے۔ اس کے منہ میں دو خوفناک دانت ہیں جن سے وہ موقعہ ملتے ہی دوسروں کا لہو پیتا ہے۔ اب کہانی کیا ــــــــ کون لکھے گا، کون سنے گا؟ یہاں تو ہر شخص کو دوسرے کا لہو پینے کی چاٹ پڑگئی ہے اور صورت یہ ہے کہ سارا شہر ڈریکولا بن گیا ہے۔ تو اب یہ کیا کریں گے؟ شاید دوسرے شہروں کا رخ کریں ــــــــ؟ لیکن میں چپ نہیں رہ سکتا،

میں بھی اگرچہ ڈریکولا ہی ہوں لیکن میں چیخ چیخ کر کہوں گا ــــــــ ہم سب ڈریکولا ہیں ــــــــ ہم سب ڈریکولا ہیں ــــــــ ہم سب ــــــــ

(۵)

بچے سے بادشاہ کے ننگے ہونے کا اعلان سن کر سارے لوگ ششدر رہ گئے۔ بادشاہ ایک لمحے کے لئے پٹپٹایا، کچھ سوچا اور جلوس کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ محل میں پہنچ کر بادشاہ نے اپنے باتدبیر مشیروں کو طلب کیا دیر تک اجلاس ہوتا رہا۔ پھر چند ہی برسوں میں ہوا یوں کہ بچہ سمیت سارے لوگ ننگے ہو گئے اور بادشاہ نے کپڑے پہن لئے اب صورت یہ ہے کہ بادشاہ جب جلوس کی صورت باہر نکلتا ہے تو سارے ننگے لوگ سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے ہیں، اور بادشاہ ان کی طرف دیکھ دیکھ کر کہتا ہے ــــــــ "واہ وا، میرے عوام نے کیسے رنگ برنگے کپڑے پہن رکھے ہیں ــــــــ واہ وا"

(۶)

کہنے کو تو بہت سی باتیں ابھی باقی ہیں، لیکن لفظ بے وفا ہو گئے ہیں۔ بس صحرا، گھپ خاموشی۔

تھیا تھیا تھیا
چھیتی کر اوئے طبیبا نئیں تاں میں تر چلی آں
چھیتی کر اوئے طبیبا
چھیتی ـــــ چھیتی

(۷)

دوسرے گواہ نے حلف اٹھانے کے بعد کہا ـــــ "جناب والا میں پہلے معزز گواہ کی تائید کرتا ہوں ، جناب اس شخص کو ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ نہیں رہنا چاہیئے ۔ دیکھیں نا جناب یہ شخص ہمیں آئینہ دکھانا چاہتا ہے احمق کہیں کا ۔ ہمیں ہماری روائتوں سے توڑنا چاہتا ہے ۔ میں بھی اگرچہ ذاتی طور پر اس کے گناہوں سے آگاہ نہیں لیکن جناب والا میں کار خیر کے طور پہ گواہی دینے حاضر ہو گیا ہوں ـــــ"

تیسرے گواہ نے کہا ـــــ "جناب والا اگرچہ دو مدلل گواہیوں کے بعد میری گواہی کی ضرورت تو نہیں رہی لیکن کام کی نیکی کی اہمیت کا خیال کر کے میں حاضر ہو گیا ہوں ـــــ"

اسی لمحہ حاضرین میں سے ایک شخص نے اٹھ کر منصف سے کہا ـــــ "لیکن جناب والا ملزم کو تو پھانسی دی جا چکی ہے پھر یہ کارروائی کس لئے ؟" منصف نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولا ـــــ "وہ تو ہمیں معلوم ہے لیکن انصاف کے تقاضے تو بہر حال پورے ہونا ہی چاہیئے نا ۔"

بنجر لہو منظر

رات شہر کے گرد اگرد کنڈل مار کے بیٹھی ہوئی ہے،
اور شہر جو کبھی تھا،
(اب خیال آتا ہے کہ شاید کبھی بھی نہیں تھا)
اندھیرے میں بتاشے کی طرح گھل رہا ہے،
میں اپنے گھر میں، اپنے کمرے میں، اپنے بستر پر چادر اوڑھے لیٹا ہوں،
اس شہر میں اب انسانوں پر دوسرے حکومت کرتے ہیں، اس لحاظ سے اب اسے ان کا شہر کہنا مناسب ہوگا، ان کا خیال ہے انسان شعور سے عاری ہیں، اس لئے انہیں شعور سکھانے کے لئے یہ انتظام ضروری ہے۔
وہ چادر کا کونا ہٹا کر سر اندر کرتا ہے ——— "تمہیں معلوم نہیں کہ چادر کے نیچے بھی سوچنا منع ہے"
چابک کی سرسراہٹیں سارے کمرے میں گونجنے لگتی ہیں۔
میں میز سے کتاب اٹھاتا ہوں،
سارے لفظ بے معنی ہو چکے ہیں۔ کتاب میں لکھا ہے انسان نے صدیوں کی مسافت

طے کر کے جدید دور میں قدم رکھا ہے۔ غلامی کا دور ختم ہوا ——————

شڑاپ ——— شڑاپ

ٹکٹکی میرے گھر کی دیواروں پر دستک دیتی ہے،

"میں غلام ابن غلام ابن غلام حاضر ہوں"

ٹکٹکی مسکراتی ہے،

کتا میرے لکھنے کی میز پر بیٹھا ہوا ہے، اس کی لمبی سرخ زبان اس کے جبڑوں سے باہر لٹک رہی ہے۔

کتاب میں لکھا ہے ———

کتاب میں سب بکواس لکھا ہے، جھوٹ ———

میں غلام ابن غلام حاضر ہوں ——— اور میرے بچے، ان کا قصور صرف یہ ہے کہ میرے گھر پیدا ہوئے ہیں ——— اس شہر میں پیدا ہوئے ہیں ———

شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں کتے تازہ خون کی مہک بونگھتے پھر رہے ہیں،

کنٹرول روم میں بیٹھا ہوا وہ ایک بٹن آف کرتا ہے،

ریڈیو، ٹی وی، اخباروں اور رسالوں میں گونجتی آوازیں، تصویریں اور خبریں ایک لمحہ میں غائب ہو جاتی ہیں، چہرے، شکلیں پلک جھپکنے میں گم ہو جاتی ہیں۔

وہ ہنستا ہے ——— ہنستا ہی چلا جاتا ہے ———

"صرف ایک بٹن آف کرنے کا وقفہ، ایک پورے کا پورا دور ختم ہو گیا، بس اتنی سی بات"

وہ دوسرا بٹن آن کرتا ہے۔

ایک لمحہ میں ریڈیو، اخباروں اور رسالوں میں نئی آوازیں نئی خبریں، ٹی وی کی سکرین پر ایک ہی پل میں پرانی تصویر کی جگہ نئی تصویر،

ایک بٹن آف، دوسرا آن، ایک لمحہ کا وقفہ۔

شہر، گھر، دفتر اور ریستوران قید خانے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ٹی وی کی سکرین پر پرانی اناؤنسر نئے دور کے شروع ہونے کی خبر دیتی ہے۔

میری بیوی ٹی وی آف کرتے ہوئے حسرت سے کہتی ہے ——— انہوں نے ہمیں پھر فتح کر لیا ہے۔"

فاتح جرنیل ٹینک پر سوار، بڑے چوک میں آتا ہے، ہجوم کو دیکھتا، پوچھتا ہے ———

"یہ کون ہیں؟"

"لوگ جناب"

"یہ لوگ ہیں" وہ ہنستا ہے ——— "اچھا تو یہ لوگ ہیں"

چبوترے پر نصب مینار پر لگی گھڑی وقت کے گزرنے کا اعلان کرتی ہے

——— لمحہ بہ لمحہ ——— لمحہ بہ لمحہ۔

"یہ کیا ہے؟"

"گھڑی جناب ——— وقت بتاتی ہے"

"لیکن ہمیں تو وقت کی کوئی ضرورت نہیں، اسے بند کر دو اور کلنڈر کو پیچھے لے جاؤ"۔

ٹکٹکی پر بندھا شخص کراہتا ہے۔

خون کی مہک سونگھ کر کتے غراتے ہیں،

پنجے مارتے ہیں،

زمین پیاس سے ہانپ رہی ہے، بہتر آدمی سینہ تانے، دیوار بنے میدان میں ڈٹے کھڑے ہیں،

وہ غراتا ہے، نیزے پر ٹنگے ہوئے سر کو دیکھ کر غراتا، پنجے مارتا، ہوا میں

سونگھتا ہے ،

عورت برف سر اوپر اٹھاتی ہے ——— "اب اجازت ہے کہ بیٹے کی لاش سولی سے اتار لوں"۔

وہ پھر غراتا ، پنجے مارتا ، ہوا میں سونگھتا ہے۔

ٹکٹکی کے سامنے سر جھکائے لمبی قطار

شٹراپ ——— شٹراپ ،

میں بیٹی سے کہتا ہوں ——— "میری بچی ، میری جان ، میں تم سے شرمندہ ہوں ، لیکن یہ میں نے بھی نہیں ، میرے باپ نے کیا تھا ، اور وہ اب زندہ نہیں ، ہم کس سے پوچھیں کہ ہمارا قصور کیا ہے ؟"

"سوال کرنا منع ہے" غراہٹ

شٹراپ ——— شٹراپ

میری بیوی چائے کی پیالی میرے سامنے رکھتے ہوئے کہتی ہے ———

"معلوم نہیں چائے کی پیالی میں چمچ کے ساتھ چینی ہلانے کی اجازت ہے یا نہیں"۔

میں سر ہلاتا ہوں ——— "معلوم نہیں"۔

میری بیٹی کہتی ہے ——— "ابو آپ کو تو کچھ بھی معلوم نہیں ، میری کتاب میں لکھا ہے انسان بڑا عظیم ہے ، وہ چاند پر پہونچ گیا ہے"۔

چبوترے پر پیچھے ہاتھ بندھے شخص کو لایا جاتا ہے۔

فرد جرم پڑھی جاتی ہے۔

یہ شخص سر اٹھا کر چلتا ہے۔

فیصلہ ——— اس کا منہ کالا کیا جائے ،

وہ اس کا منہ کالا کرتے ہیں ،

پھر تالیاں بجاتے، نعرے لگاتے ہیں۔

"ابو انسان بہت عظیم ہے نا۔"

"شاید ہے، یا پھر شاید نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"شاید کسی جگہ ہوتا ہوگا، کسی جگہ نہیں ہوتا ہوگا۔"

"تم نے اس زمانے کے بارے میں کچھ بھی نہیں پڑھا۔" بوڑھا چچا برف بھوئیں اٹھاتا ہے ـــــــــ "دشمن جب شہر میں داخل ہوتا تو خوف سڑکوں پر کنڈل مار کے بیٹھ جاتا، وہ سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کو گریبانوں سے پکڑ پکڑ کر ٹھڈے مار مار کر پوچھتے ـــــــــ کون ہو تم؟"

"کون ہو تم؟"

"میں ـــــــــ میں۔"

"جھک کر کیوں چلتے ہو؟"

"پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔"

"کیوں لگی ہے؟"

"گر گیا تھا۔"

"کیوں گرے تھے؟"

"جی پتہ نہیں ـــــــــ بس قسمت جو خراب ہے۔"

شڑاپ ـــــــــ شڑاپ،

بوڑھا چچا برف بھوئیں جھکاتا ہے ـــــــــ "وہ گھروں میں گھس جاتے اور عورتوں کو ـــــــــ لڑکیوں کو ـــــــــ"

میری پیٹھ پر ٹکور کرتی بیوی اچھل کر بیٹی کو گود میں اٹھا لیتی ہے،

"دروازہ تو بند ہے نا"

"بند ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا"

رات دبے پاؤں چلتی آپ ہی آپ مسکراتی ہے،

اندر ہی اندر کھکھلاتی ہے،

چادر کے نیچے میں اپنا ہاتھ بیوی کے ہاتھ پر رکھتا ہوں،

وہ چادر ہٹا کر سر اندر کرتا ہے ——— "اپنے گھر میں، اپنی چادر کے نیچے بھی تم اپنی بیوی کے سارے جسم کو نہیں دیکھ سکتے"

ٹمٹکی شہر میں گھوم رہی ہے،

ٹٹراپ ——— ٹٹراپ،

میری بیٹی سبق یاد کرتی ہے ——— "انسان بڑا عظیم ہے ——— انسان بڑا عظیم ہے ——— انسان ———"

میں خواب دیکھتا ہوں کہ جیسے خوبصورت باغ میں ہوں۔ چاروں طرف پھول کھلے ہوئے ہیں۔ پھل شاخوں سے جھول رہے ہیں، پرندے چہچہا رہے ہیں۔

میری بیوی کہتی ——— "کتنی اچھی خوشبو ہے"

"ابی پھول کتنے پیارے ہیں" میری بیٹی چہکتی ہے۔ مگر اس کی آواز تیز شور میں ڈوب جاتی ہے۔ سوروں کا ایک گروہ کا گروہ شور مچاتا، دندناتا، باغ کی دیواروں کو توڑتا، روندتا کیاریوں اور پودوں کو روندتا چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔

"میری بیٹی ——— میری بچی" میں اس کی طرف بڑھتا ہوں، درد کی ایک ٹیس ——— خون کا فوارا ——— ایک لمبی چیخ

"کیا ہوا ——— "ساتھ والے پلنگ پر سوئی ہوئی بیوی اور بیٹی ہڑ بڑا کر اُٹھ جاتی ہیں ——— "کیا ہوا"

"کچھ نہیں ______ کچھ نہیں ، شاید خواب تھا ______ شاید "
دونوں سہمی نظروں سے مجھے دیکھتی ہیں ______ دیکھتی ہی رہتی ہیں ۔
مست، بپھرے ہوئے سور شور مچاتے ، شہر کی گلیوں اور بازاروں میں دوڑ رہے ہیں ، دروازے توڑ رہے ہیں ،
ٹکریں مار رہے ہیں ، ڈکار رہے ہیں ______
اور رات شہر کے گرد اگرد کنڈل مار کے بیٹھی ہوئی ہے ،
اور شہر جو کبھی تھا
اب خیال آتا ہے کہ شاید کبھی بھی نہیں تھا ،
اندھیرے میں بتاشے کی طرح گھل رہا ہے ______ گھل رہا ہے ،
گھل رہا ہے !

چلتے رہنا بھی اک موت ہے

جوں ہی رات دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتی ہے، کارنس پر رکھا مجسّمہ آہستہ سے نیچے اترتا ہے اور اس سرہانے آکر کھڑا ہو جاتا ہے، وہ پوچھتا ہے ــــ "کون؟"

مجسّمہ کہتا ہے ــــ "میں"

"میں کون؟"

"میں ماضی ہوں۔"

وہ سر اٹھا کر اُسے دیکھتا ہے ــــ "لیکن میں تمہیں نہیں پہچانتا۔" مجسّمہ مسکراتا ہے ــــ "ماضی سے سب کو خوف آتا ہے۔"

وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا اور مجسّمہ کی پتھرائی آنکھوں میں منجمد یادوں کو کریدنے کی کوشش کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ مجسّمہ کی پتھرائی آنکھوں میں شناسائی کی گرماہٹ سر ابھارتی ہے، اُسے اپنا آپ ڈوبتا محسوس ہوتا ہے۔ چند لمحوں میں کمرے کی ساری چیزیں ایک ایک کر کے گم ہوتے لگتی ہیں۔ چار دیواری اپنا دامن سمیٹ لیتی ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ موجیں مارتا دریا اس کے سامنے ہے، اور وہ مجسّمے کی

انگلی تھامے اس کے کنارے کنارے چلا جارہا ہے۔

"یہ کون سا دریا ہے؟" وہ پوچھتا ہے۔

مجسمہ لمحہ بھر کے لئے دریا کو دیکھتا ہے پھر کہتا ہے —— "یہ وقت ہے اور وقت کسی کا نہیں بنتا۔"

کچھ آگے جا کر کسی شہر کے آثار شروع ہوتے ہیں۔

"یہ کون سا شہر ہے؟"

"یہ ہمارا وجود ہے، جسے ہم جانتے ہیں اور نہیں بھی جانتے۔"

وہ شہر میں داخل ہوتے ہیں۔

سڑکوں پر عجیب ویرانی ہے۔

وہ چلتے چلے جاتے ہیں، لیکن کسی سے ملاقات نہیں ہوتی،

"یہ کیسا شہر ہے جہاں کوئی نہیں رہتا"

مجسمے کی پتھریلی آنکھوں میں زندگی رینگنے لگتی ہے اور اس کی پتھر انگلی میں لمس لہراتا ہے۔

وہ پھر اپنا سوال دہراتا ہے —— "یہ کیسا شہر ہے؟"

مجسمہ ہنستا ہے اور ہنستے ہنستے اس کا پتھریلا جسم ملائم ہوتا جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس جیسے جتنے جاگتے آدمی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

وہ چونک کر اس قلب ماہیت کا منظر دیکھتا ہے۔

مجسمہ جواب آدمی بن گیا ہے، اپنے ہاتھوں کو جھٹک کر پورے جسم کو ہلاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی شہر کی گلیوں، سڑکوں پر آدمی ایسے نمودار ہوتے ہیں۔ جیسے پلک جھپکتے میں زمین سے اُگ آئے ہوں۔

وہ لمحہ بھر کے لئے ڈر جاتا ہے۔

چاروں طرف لوگوں کے بولنے کا شور اور ان کے چلنے پھرنے کی حرکتیں اسے بوکھلا دیتی ہیں۔

"یہ کیا ہے ـــــ کیا میں کسی طلسم میں پھنس گیا ہوں؟"

مجسمہ جواب آدمی بن گیا ہے ـــــ کہتا ہے "یہ سب میں ہوں اور میں تم ہو ـــــ اس لئے یہ سب کچھ تم ہی تم ہو"

اسے کچھ سمجھ نہیں آتا۔

شہر کا منظر کھلتا چلا جاتا ہے۔ سڑکوں اور گلیوں میں باتیں کرتے لوگ اس کی موجودگی سے بے خبر اپنی اپنی دنیا میں گم ہیں۔ دفعتاً منظر بدلتا ہے، ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے لوگ یک دم، کسی غیبی اثر سے، اپنی بانہیں چھڑا کر دور دور ہٹ جاتے ہیں اور پھر چشم زدن میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے ہیں۔ چیختے چلاتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ وہ بھی اسی دھکم پیل اور مار دھاڑ میں بھاگ پڑتا ہے، بھاگتے بھاگتے اس کی نظر ایک بچے پر پڑتی ہے جسے دوسرا بچہ نیچے گرا کر مارنے لگتا ہے۔ وہ چیختا ہے۔ یہ تو میرا بیٹا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے، نہیں یہ میں ہوں، پھر دفعتاً ایک اور خیال آتا ہے، نہیں یہ میرا باپ ہے۔ نہیں یہ نہیں ـــــ نہیں میرا بیٹا ـــــ نہیں میرا باپ ہم ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ وہ مارنے والا ہے اور نیچے گرا ہوا اس کا بیٹا ہے۔ نہیں نہیں مارنے والا اس کا باپ ہے اور نیچے گرا ہوا وہ ہے۔ وہ چیختا ہے۔ مجھے مت مارو مجھے مت مارو ـــــ وہ چیختا چلاتا جاتا ہے۔ منظر آہستہ آہستہ بدلتا ہے۔ شہر اور لڑتے لوگ دھندلے ہوتے ہوتے گم ہو جاتے ہیں۔ اس کا کمرہ آہستہ آہستہ اسکرین پر ابھرتا ہے، رات دبے پاؤں اس کے کمرے سے نکل جاتی ہے اور مجسمہ کارنس پر جا کر پھر سے پتھر ہو جاتا ہے۔

وہ گھبرا کر ساتھ والے بستر پر سوتی بیوی اور بیٹے کو دیکھتا ہے۔

"شکر ہے"۔ وہ اطمینان کا لمبا سانس لیتا ہے۔ دن دروازے پر دستک دیتا ہے۔ وہ بستر سے اٹھتے ہوئے اپنے آپ سے کہتا ہے "آج کی رات بھی بیت گئی"۔ لیکن اسے خوف ہے کہ کسی صبح جب وہ سو کر اٹھے گا تو یا تو ساتھ والے بستر پر اس کا بیٹا نہیں ہوگا، یا وہ خود نہیں ہوگا۔

اور کارنس پر رکھے مجسمہ کے ساتھ ایک اور مجسمے کا اضافہ ہو جائے گا!

بجھی چنگاریوں میں ایک چمک

تصویر اس کے بیڈ کے بالکل سامنے اس طرح آویزاں ہے کہ سونے سے پہلے اور صبح آنکھ کھلتے ہی نظر اس پر پڑتی ہے۔ بھورے رنگ کے فریم میں قید بہت سے ہاتھ ہیں، اٹھے ہوئے ہاتھ جن کی ہیلی، ہتھیلیوں پر آگ روشن ہے۔ کھلی آنکھوں سے آگ جلاتی کاٹتی محسوس ہوتی ہے، لیکن جب اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر دھندلا رہی ہوتی ہیں تو آگ ننھے ننھے چراغوں میں بدل جاتی ہے۔ اور ہتھیلیوں پر رقص شروع ہو جاتا ہے، لیکن صبح آنکھ کھلتے ہی جب اس کی نظر پڑتی ہے تو شعلے جلانے لگتے ہیں۔

وہ ان ہاتھوں کے چہرے کو دیکھنا چاہتا ہے کہ پھیلے ہاتھ کی ہتھیلیوں پر روشن آگ کبھی اُسے جلاتی ہے کبھی گدگداتی ہے۔ اور چہرے تو کبھی اس کی گرفت میں نہیں آنے۔ یہ چہرے بھی عجیب ہوتے ہیں، پڑھنے کے لئے جھکو تو پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور نہ پڑھنا چاہو تو جھک جھک پڑتے ہیں۔

تصویریں بھی عجیب ہوتی ہیں جس لمحہ کو چاہیں قید کرلیں، جس لذت کو چاہیں دائمی بنالیں، دکھ کے لمحے کو بھی ـــــــ لیکن دُکھ کا لمحہ تو یوں بھی دائمی ہی ہوتا ہے کہ داغ مٹ بھی جائے تو کسک نہیں جاتی۔

اور یہ قیدی ہاتھ، جن کی ہتھیلیوں پر چراغ جل رہے ہیں، اس کسک ہی کی تو یاد ہیں اور وہ چہرہ جانے اب کہاں ہوگا۔ اس کی بند ہوتی بوجھل آنکھوں میں چراغ جھلملاتے ہیں، منظر دھیرے دھیرے اپنے بازو وا کرتا ہے اور اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیتا ہے۔

وہ قدم قدم آگے بڑھتی ہے اور اپنی غلافی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے۔

لمحہ منجمد ہو جاتا ہے۔

چراغوں کی لو میں وہ بپھرتے دریا اور کھرتے کناروں کو دیکھتا ہے۔

زندگی بھی عجیب چیز ہے، سانس کے اس طرف ایک منظر، اور دوسری طرف دوسرا منظر،

وہ کہتا ہے ــــــ "انتظار ایک عجیب ذائقہ ہے جس کی لذت برسوں ختم نہیں ہوتی"۔

وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہے ــــــ "اور یہ ازل کا لمحہ ہے، شاید ابد بھی"۔

خاموشی رینگ رینگ کر ان کے درمیان جمع ہو جاتی ہے ایک دھند ہے، وہ اس دھند میں سائے بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں وہ کہتا ہے ــــــ "دریا جوش میں ہے اور انجام قریب آرہا ہے"۔ وہ مسکراتی ہے ــــــ "انجام کی پروا کسے ہے"؟

دوسرے کنارے پر دو گھورتی غصہ بھری آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہیں، ایک اطمینان ــــــ بس اب کھیل ختم ہونے والا ہے۔

اس کنارے پر وہ ہنستی ہے ــــــ "کھیل تو اب شروع ہوگا، ازل اور ابد ایک دوسرے سے ہم کنار ہونے والے ہیں"۔

غنودگی کے اس لمحہ میں، وہ آنکھیں پھیلا کر تصویر کو دیکھتا ہے۔ اُٹھے ہاتھوں کی پھیلی ہتھیلیوں پر جلتے چراغوں کی لو لمحہ بھر کے لئے تیز ہوتی ہے پھر دھیرے دھیرے

مدھم ہوتی چلی جاتی ہے ، آنکھیں بند ہوتے ہوتے ، وہ اس چہرے کا تصور کرتا ہے ، جواب ان ہاتھوں سے دور کہیں چھپا بیٹھا ہے ۔

وہ رقص کرتی آتی ہے ۔

وہ ونجلی نیچے رکھ دیتا ہے ۔

وہ پوچھتی ہے ——— "ونجلی بجانی کیوں بند کر دی ؟"

وہ کہتا ہے ——— "اس کی تان تو تم ہو"

وہ ہنستی ہے ——— "تمہاری باتوں میں ایک عجیب مزہ ہے"

"ہاں ، تعلق ایک مزہ ہی ہے ، ایک عجیب لذت ، جس کی مٹھاس صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے"

اور یہ اٹھے ہاتھ اور پھیلی ہتھیلیاں صدیوں سے منتظر ہیں ۔

وہ لمحہ ۔

جانے وہ لمحہ جدائی کا ہے یا وصال کا ۔

جدائی کیا ہے ؟ وصال کیا ہے ؟

وہ سر ہلاتی ہے ——— "جدائی اور وصال ایک ہی لمحہ کے دو رخ ہیں"

وہ کچھ نہیں بولتا ۔

وہ کہتی ہے ——— "ہم ایک لمحے میں جدا ہوتے ہیں اور اگلے لمحہ میں مل جاتے ہیں"

"پھر جدا ہو جانے کے لئے"

"جدائی ، ایک خوشبو ہے" اور جب یہ خوشبو پھیلتی ہے تو اٹھے ہاتھوں کی پھیلی ہتھیلیوں پر چراغ جل اٹھتے ہیں ۔

"یہ عجیب تصویر ہے، مجھے تو کبھی کبھی اس سے آوازیں آتی محسوس ہوتی ہیں"۔ پھر اپنے آپ سے کہتا ہے ——— "وہ ابھی تک مجھے نہیں بھولی۔ اور یہ تصویر بھی تو اسی نے بنائی تھی"۔

اور دور بہت دور گھر کی آخری سیڑھی پر بیٹھی وہ سوچ رہی ہے ——— "وہ لوٹ کر نہیں آیا، یہ بہار بھی یوں ہی گزر گئی"۔
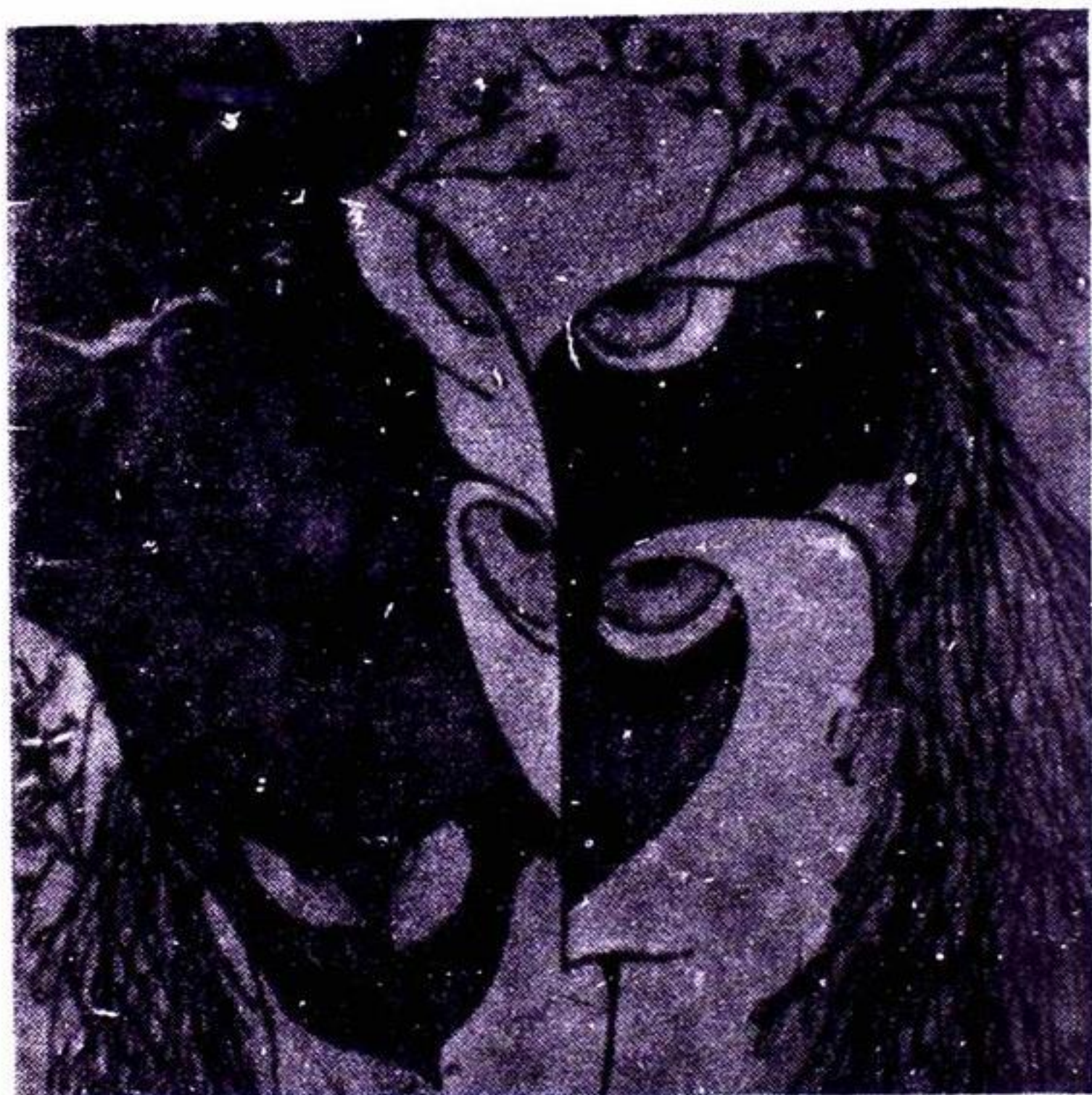
سوالیہ ہاتھ کے دروازوں میں

شیشے کی آنکھوں میں تیرتا سورج، دروازہ بند ہوتے ہی، اس کی گود میں آن گرا۔

اس نے کلبلا کر پہلو بدلا،

اس بچھڑے ہوئے چہرے کی نمکین اداسی کا ذائقہ ابھی تک اس کے ہونٹوں کی پلیٹ میں سرسرا رہا تھا۔

اُس نے سوچا۔ عجیب بات ہے میں جب بھی سفر کرتا ہوں، میرے سامنے ایسے ہی اداس چہرے آتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جب اداسی کوکتی ہے تو سارے اداس لوگ اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں،

اسے خیال آیا ——— وہ تو خود، دور دراز اونچے پہاڑوں میں گھری ہوئی ایسی تنہا جھیل ہے جس کی سیر کے لئے آج تک کوئی نہیں آیا۔ کسی نے اس کی تہہ میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ تہہ میں جھانکنا تو الگ، کسی نے اس کی سطح کو بھی نہیں چھوا۔

اسے تو حسرت ہی رہی تھی کہ کبھی کوئی کنکر پھینک کر ہی اس کی سوئی ہوئی سطح کو جگا دے،

لیکن وہ تو سو رہا تھا۔

ایک گہری نیند،

کبھی کبھی وہ سوچتا میں سویا ہوا ہی پیدا ہوا ہوں اور اسی سوئی ہوئی حالت میں مر جاؤں گا،

بس ایک کنکھ،

ایک چھوٹے سے کنکھ کی خواہش ہر لمحہ اس کے سینے کے پنجرے میں پھڑکتی رہتی تھی۔

لیکن اُسے تو ہمیشہ اداس اور سوتے ہوئے چہروں ہی سے واسطہ پڑتا تھا۔

اور اب پھر یہ اداس، سویا ہوا چہرہ ریل کار کی نشستوں کی بالکونی میں سے جھانک جھانک کر اسے اپنی طرف بلا رہا تھا،

یہ چہرہ۔

یہ چہرہ تو کسی بکھرے ہوئے خواب کے خیمہ کی ٹوٹی ہوئی طناب تھا، جو اُس کے سامنے لٹک رہی تھی۔

خواب۔

لیکن خواب تو وہ خود بھی تھا کہ اُس نے ہمیشہ خواب ہی میں چیزوں کو دیکھا اور پہچانا تھا،

آنکھ کھلتی تو اس کے ہاتھوں میں کچھ بھی نہ ہوتا۔

بس ریزہ ریزہ یادیں اور بکھرے ٹوٹے چہرے، لیکن ان سب ٹوٹے پھوٹے چہروں میں ایک چہرہ ایسا ضرور تھا، جسے وہ مدتوں سے تلاش کر رہا تھا، مگر شاید وہ چہرہ نہیں تھا۔ بلکہ کسی چہرے کی دھندلی سی شبیہہ تھی۔ اس نے ہمیشہ اس دھندلی شبیہہ کو ٹکڑوں اور ریزوں ہی میں دیکھا تھا، کبھی اس چہرے کی پیشانی کسی دوسرے چہرے کی ٹیرس سے جھانکتی ہوئی نظر آجاتی، کبھی اس چہرے کی آنکھیں کسی دوسرے چہرے کی ادھ

کھلی کھڑکیوں میں آن کھڑی ہوتیں،
کبھی ہونٹ ـــ کبھی ٹھوڑی، اور کبھی کوئی اور حصہ کسی نہ کسی دوسرے چہرے کی
عمارت میں سے جھانک کر اسے اپنی طرف بلا لیتا، لیکن پورا چہرہ ـ
وہ پیشانی ــــ آنکھیں ــــ ہونٹ، کبھی ایک ساتھ نظر نہیں آتے تھے،
اور اس وقت بھی اس سامنے بیٹھے اداس چہرے پر پڑتی اداسی کی پھوار میں چھپی
آنکھیں بار بار اس کی شناسائی کے دروازے پر دستکیں دے رہی تھیں،
تو دکھ بھی ایک رشتہ ہے
اور ہم سب درد کی اس سلائی میں پروئے ہوئے وجود ہیں جنھیں بھڑکتی آگ پر روسٹ
کیا جا رہا ہے،
اور یادیں،
یادیں تو اب لمحہ کے بطن میں چھپی ہوئی ہیں،
بس ایک لمحہ
اور جب اس لمحہ کے نطفے میں سے دکھ کی خوشبو نکلتی ہے تو لمحہ پھیل کر صدیوں
کے دامن کو جا چھوتا ہے۔
پہلے دکھ کے لفظ سالوں کے صفحوں میں بھی پورے نہیں آتے تھے۔
لیکن اب،
اب تو ایک لمحہ ہی صدیوں جیسی گہرائی لئے ہوئے ہے،
بس ایک لمحہ،
اور یہ وہی لمحہ تھا، جب اس چہرے کی شبیہہ میں سے کوئی ایک بکھرا سا ٹکڑا اس
کے سامنے آجاتا، اور اسے یہ احساس ہونے لگتا کہ وہ ابھی تک سویا ہوا ہے،
بس ایک کنکری کے انتظار میں جو شاید اس چہرے میں چھپی ہوئی تھی۔

لیکن وہ چہرہ تو ٹکڑے، ٹکڑے۔ بکھرے بکھرے،

اور اس وقت بھی اُس کی آنکھوں پر کھڑی یہ سانولی اداسی اسے آوازیں دے رہی تھی۔

تو یہ بھی میری طرح ایک دکھی چہرہ ہے۔ اس نے سوچا۔ اور کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگا۔

اس کے تازہ رسے کانوں میں پڑے مُندرے اس کے گالوں کی سرحدوں کو چھو رہے تھے اور ہاتھ میں پکڑا ہوا کاسا سامنے کھڑے مانوس چہرے کے سامنے پھیلا ہوا تھا،

خوشی کا ایک حرف۔

بس ایک حرف ——— صرف ایک حرف

لیکن اس کے کاسے میں تو چھید تھا

اُس نے کندھوں پر بیٹھی ہوئی اداسی اور دکھ کی چڑیوں کو اڑانا چاہا، چڑیاں ریل کار میں منڈلانے لگیں اور ان میں سے ایک سامنے والے چہرے کی اداس چھاؤں میں سکڑ کر بیٹھ گئی

طویل داستانیں کتنی کئی سلگتے دنوں اور کئی ٹھٹھرتی راتوں کے بدن پر پھیلی ہوئی تھیں۔

لیکن اب

اب تو صرف ایک لمحہ ہے، بس ایک لمحہ

دریا کی ٹھنڈی، اچھلتی لہروں نے اس کے جسم کی دیواروں کو پہلا بوسہ دیا۔ اُس سے چند ہی فٹ کے فاصلہ پر لہریں اُس چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اٹھائے بھاگی چلی جا رہی تھیں۔

اور چند ہی فٹ ادھر ...

موت اس کے ٹھنڈے لبوں کو بوسہ دے رہی تھی ،

لیکن موت تو پھسلتی ریت ہے ،

جو ہر بار اس کے وجود کی چھلنی میں سے نیچے جا گرتی ہے ۔

مسکراہٹ ایک اداس رنگ تتلی کی طرح اس کے ہونٹوں کی ڈالی پر آن بیٹھی ،

ترکش درخت کی آخری ٹہنی پر اٹکا ہوا تھا ، اور وہ اسے چاروں طرف سے گھیرے کھڑے تھے ۔ اس نے گرنے سے پہلے سامنے لٹکے ہوئے اداس چہرے کو اپنی آنکھوں کی زبان سے بوسہ دیا اور ریل کار کی کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا ۔ زمین تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگ رہی تھی ، اور اداسی بھاگتی زمین پر پاؤں جماتی اس کی طرف بڑھ رہی تھی ، اس کے سارے تیر ٹوٹے ہوئے تھے اور بے بسی کی چیلیں اپنی آنکھوں میں بھوک کی شمعیں جلائے اس کے چاروں طرف منڈلا رہی تھیں ۔

اس نے کھڑکی بند کر دی اور ایک دو لمحے تذبذب کے رسے پر جھولنے کے بعد اس اداس چہرے پر کود گیا ،

وہ کھردرا ، ٹھنڈا چہرہ ویران پڑا تھا ۔

اس نے اپنے شوق کے پوروں سے اس کے پیچھے پیچھے کو ٹٹولا ، اور اپنی تمنا کی زبان سے چاٹ چاٹ کر اسے جگانا چاہا کہ شاید وہ گمشدہ شبیہہ کہیں چھپی ہوئی نظر آ جائے ،

لیکن یہ اداس چہرہ تو اس کے اپنے دل کی طرح ٹھنڈا ہے ۔

اس کا دل ۔

اس کے سینے میں دل کی جگہ ایک پنجرہ ہے ۔ جس میں ایک پرندہ قید ہے ۔

کبھی یہ پرندہ خود ہی پھڑکنے لگتا ، کبھی خود ہی مرجھا کر گر پڑتا اور اس کے پر پنجرے کی تیلیوں سے ٹکرا ٹکرا کر بکھر جاتے ،

اور اس کی ساری خواہشیں بکھرے پروں کے تابوت میں سج کر اس کے بدن

کے گلی کوچوں میں سے گزرتیں اور دور پہاڑوں میں گھری ہوئی تنہا جھیل میں چھپا ہوا کوئی
دھندلاتے دھندلاتے ہواؤں میں گم ہو جاتا،

اور پھر کبھی راہ چلتے
کبھی کسی ریستوراں میں
کبھی کسی سینما ہاؤس میں
کبھی کسی تقریب
کبھی کسی سفر میں
اس چہرے کا کوئی نہ کوئی بکھرا ٹکڑا اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا
کبھی آنکھیں
کبھی ہونٹ
کبھی پیشانی
کبھی کچھ ــــــــ کبھی کچھ

اور اس وقت بھی اس اداس چہرے کے البم میں سجی ہوئی یہ آنکھیں، وہ ان آنکھوں میں تیرتے خوابوں کے چمکیلے ریشمی لمس کو اپنی انگلیوں سے چھونا چاہتا ہے، لیکن اس کی انگلیوں کی پوروں پہ تو لمبی لمبی نکیلی چونچوں والے پرندوں کے گھونسلے ہیں جو اس سرمئی لمس کو اس کے قریب آنے سے پہلے ہی تار تار کر دیتے ہیں۔

تار تار تو وہ خود بھی ہے۔

ایک تار تار چادر

اسی لئے ہر چیز اس کے بدن کی چھلنی میں سے نیچے جا گرتی ہے، چمکیلے لمس، والے خواب، دھندلی شبیہیں بناتے چہرے اور سرسراتی یادیں،

اس کے اپنے پاس کچھ بھی نہیں۔

بس ایک سوچ

جو جانے کیسے اس کے تارتار بدن کی دھجیوں سے چپک کر رہ گئی ہے، ایک خواہش ۔۔ کہ کوئی جھیل کی سوئی ہوئی سطح پہ ایک کنکری پھینکے، بس ایک چھوٹی سی کنکری،

اور اس نے کئی بار اپنے آپ کو جدائی کے سانپ سے بھی ڈسوایا ہے لیکن زہر اس کے بدن کے چھیدوں میں سے قطرہ قطرہ ٹپک جاتا ہے۔ ہاتھوں کے چلوؤں میں کئی بار چمکیلے خوابوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن جب خواب بوند بوند اس کے ہاتھ کے لپک میں جمع ہوتے ہیں تو کوئی سسکار جیسی آنکھوں سے اس کی ہتھیلیوں میں چھید کر دیتا ہے، سارے خواب قطرہ قطرہ نیچے جا گرتے ہیں اور اُسے اس وقت معلوم ہوتا ہے جب اس کی دونوں ہتھیلیوں پہ خالی پن پھر سے ناچنے لگتا ہے۔

وہ دوبارہ جھیل بن جاتا ہے

ایک کنکری کے انتظار میں ــــــــــ بس ایک چھوٹی سی کنکری کے انتظار میں۔

اس نے مڑ کر اس اداس چہرے کی تلاشی لینا شروع کر دی، لیکن اس ویران چہرے کی گلیوں میں شناسائی کی ایک بھی شمع روشن نہ تھی،

تو کیا پھر ان کے درمیان صرف دکھ ہی کا رشتہ ہے

اُس نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر تازہ ہواؤں کو اپنے سانسوں کے رسوں میں جکڑنے کی کوشش کی، جس طرح وہ کبھی اپنے تارتار بدن کی کھڑکیوں میں سے جھانک کر پاس سے گزرتی چیزوں کے لمس کو پکڑنے کی کوشش کیا کرتا تھا، لیکن جونہی کوئی شے اس کے ہاتھوں کی گرفت میں آنے لگتی، اس کی انگلیوں کی پوروں پہ بیٹھے ہوئے سارے پرندے پھڑپھڑا کر اپنے گھونسلوں سے نکل آتے اور خواہشیں دھجی دھجی ہو کر چاروں طرف بکھر جاتیں۔

وہ بھوکے بچّے کی طرح بلک بلک کر خود ہی سو جاتا۔
اور وقت کی غلیل میں سے کئی دن ایک ایک کر کے ماضی کی جھولی میں جا گرتے۔
پھر کسی بس اسٹاپ پر
کسی ریستوراں میں
کسی تقریب میں
کسی سفر میں
اُس چہرے کا کوئی بکھرا ٹوٹا ٹکڑا کسی دوسرے چہرے کی پلیٹ میں سج کر اُس کے سامنے آجاتا۔
اور پھر وہی ہتھیلیوں کی اوک میں خوابوں کو بوند بوند اکٹھا کرنا
اور ——— اور ———،
اس نے پہلو بدل کر اپنا سر دوسری طرف کر لیا، آج وہ اپنی ہتھیلیوں کا کٹورا نہیں بنائے گا۔
وہ تیزی سے گزرتے کھمبوں کو گننے لگا
ایک، دو، تین ——— چوتھے کھمبے کی جگہ وہ چہرے سامنے آگیا
اُس نے سر جھٹک کر گزرتے درختوں کو گننا چاہا
ایک، دو، تین ——— چوتھے درخت کی بجائے وہی چہرہ
پھر اس نے بھاگتی زمین کی طرف دیکھنا شروع کیا۔
لیکن وہ وہاں بھی تھا۔
وہ تو بادلوں کے بکھرے ٹکڑوں میں بھی تھا۔
اس نے سر اندر کر لیا
وہ اداس چہرہ سامنے موجود تھا۔

تو کیا اداس چہرے ہی میرا مقدر ہیں ۔ اُس نے سر جھٹکا، لیکن اُسے احساس ہوا کہ اس کی گردن کی حرکت بہت ہلکی ہے۔ اُس کے ہاتھوں نے بے ساختہ اپنی گردن کو چھونا چاہا، لیکن اس کی انگلیاں خلا میں جھول کر رہ گئیں۔

اس کی گردن پر کچھ بھی نہیں تھا،

تو وہ دیکھ کہاں سے رہا ہے۔ ــــــ اس کی آنکھیں

اُس کی آنکھیں تو سامنے والے اداس چہرے پر تھیں، اس کے ہونٹ، اس کے گال، اس کے کان،

ــــــ خدا جانے کہاں کہاں کس کس چہرے میں چھپے ہوئے تھے،

تو اصل میں وہ اب تک اپنا ہی چہرہ تلاش کرتا رہا ہے۔

اُس رات وہ ایک مکان کی دیوار پھاند کر اندر کود گیا، اور ایک عورت کے بستر میں چپکے سے گھس کر گم ہو گیا۔

بستر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا "شاید اس بار پورے چہرے کے ساتھ پیدا ہو جاؤں۔ ــــــ شاید"
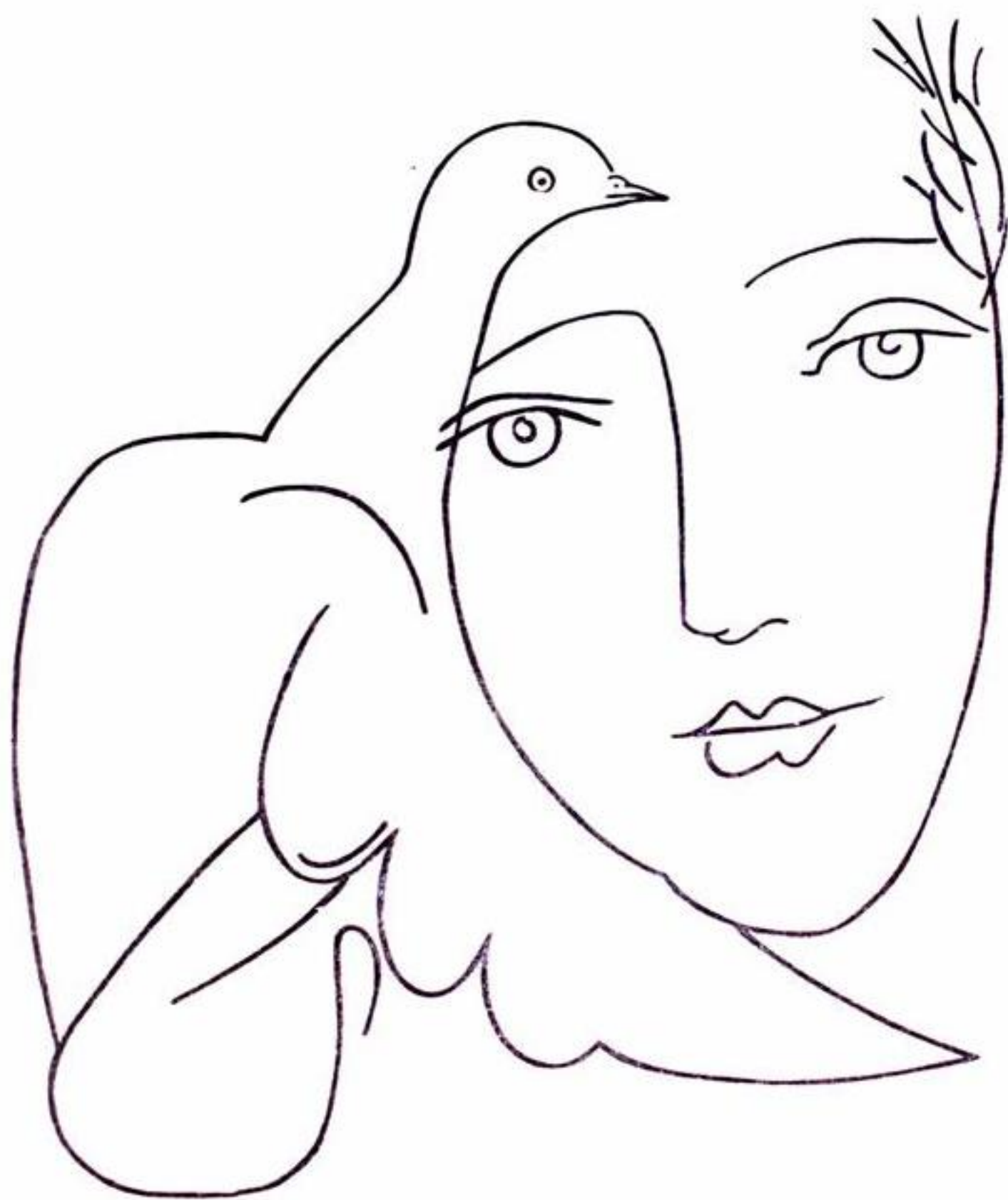
ہمارے چاروں طرف کہانیاں بہت ہیں، مگر کہانی لکھنے والے کم۔ کہانی کے نام پر جتنا کچھ سامنے آتا ہے اُسے کہانی ماننے والے کے لیے خاصی فراخدلی کی ضرورت ہے۔ رشید امجد گنتی کے اُن لوگوں میں ہیں جو کہانی کی بُنیاد بننے والی سچائی سے لے کر کہانی کے وجود میں آنے تک، سارے مرحلوں سے گزرتے ہیں، اسی لیے اُن کی کہانی صرف اُن کا ہی نہیں، ہمارا تجربہ بھی بنتی ہے۔ تجربے کی تنظیم پر، بیان اور اُسلوب پر، اپنے حسی، جذباتی، ذہنی اور لسانی ردِعمل پر رشید امجد کی گرفت غیر معمولی ہے۔ رشید امجد کی کہانیوں سے ایک ساتھ کتنے چہرے جھانکتے ہیں —— رشید امجد کے زمان و مکان کا چہرہ خود رشید امجد کا چہرہ اور پھر کہانی کا اپنا چہرہ، ان میں کوئی بھی کسی کے ہاتھوں خراب نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ عام زندگی کے تجربے، تخلیقی تجربے اور ان دونوں تجربوں کی تہہ سے برآمد ہونے والی اکائی میں، جو کہانی کے طور پر ایک نیا تجربہ بنتی ہے۔ تناسب ہمیشہ قائم رہتا ہے، اس لحاظ سے رشید امجد منتخبات میں شمار کیے جا سکتے ہیں اور اسی لیے رشید امجد کی کہانی ایک دستاویز کے طور پر، ادراک و احساس کے ایک نو دریافت زاویے کے طور پر، اور ایک تخلیقی منطقے کے طور پر، ایک ساتھ اپنی حفاظت کرسکتی ہے۔

شہر دلی ۳ر جولائی ۱۹۸۸ء — شمیم حنفی

ISBN 969 442 262 0 Rs. 70.00